غلام عباس کے
دس بہترین افسانے

غلام عباس

غلام عباس کے

دس بہترین افسانے

غلام عباس

کتبہ

شہر سے کوئی ڈیڑھ میل کے فاصلے پر فضا باغوں اور پھلواریوں میں گھری ہوئی۔ قریب قریب ایک ہی وضع کی بنی ہوئی عمارتوں کا ایک سلسلہ ہے جو دور تک پھیلتا چلا گیا۔ ان عمارتوں میں کئی چھوٹے بڑے دفتر ہیں جن میں کم وبیش چار ہزار آدمی کام کرتے ہیں۔ دن کے وقت اس علاقے کی چہل پہل اور گہما گہمی عموماً کمروں کی چار دیواری ہی میں محدود رہتی ہے۔ مگر صبح کو ساڑھے دس بجے سے پہلے اور سہ پہر کو ساڑھے چار بجے کے بعد وہ سیدھی اور چوڑی چکلی سڑک جو شہر کے بڑے دروازے سے اس علاقے تک جاتی ہے۔ ایک ایسے دریا کا روپ دھار لیتی ہے جو پہاڑوں سے آیا ہو اور اپنے ساتھ بہت سا خس وخاشاک بہا لایا ہو۔

گرمی کا زمانہ تھا' سہ پہر کا وقت تھا' سڑکوں پر درختوں کے سائے لمبے ہونے شروع ہو گئے تھے مگر ابھی تک زمین کی تپش کا یہ حال تھا کہ جوتوں کے اندر تلوے جھلسے جاتے تھے۔ ابھی ابھی ایک چھڑکاؤ گاڑی گزری تھی۔ سڑک پر جہاں جہاں پانی پڑا تھا۔ ابخرات اٹھ رہے تھے۔

شریف حسین کلرک درجہ دوم معمول سے کچھ سویرے دفتر سے نکلا اور اس بڑے پھاٹک کے باہر آ کر کھڑا ہو گیا جہاں سے تانگے والے شہر کی سواریاں لے جایا کرتے تھے۔ گھر کو لوٹتے ہوئے آدھے راستے تک تانگے میں سوار ہو کر جانا ایک ایسا لطف تھا جو اسے مہینے کے شروع میں صرف چار پانچ روز ہی ملا کرتا تھا اور آج کا دن بھی انہی مبارک دنوں میں سے تھا۔ آج خلاف معمول تنخواہ کے آٹھ روز بعد بھی اس کی جیب میں پانچ روپے کا نوٹ اور کچھ آنے پیسے پڑے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ اس کی بیوی مہینے کے شروع ہی میں بچوں کو لے کر میکے گئی تھی اور گھر میں وہ اکیلا رہ گیا تھا۔ دن میں دفتر کے حلوائی سے دو چار پوریاں لے کر کھا لی تھیں اور اوپر سے پانی پی کر پیٹ بھر لیا تھا۔ رات کو شہر کے کسی سستے ہوٹل میں جانے کی ٹھہرائی تھی۔ بس بے فکری ہی بے فکری تھی۔ گھر میں کچھ ایسا اثاثہ تھا نہیں جس کی رکھوالی کرنی پڑتی۔ اس لئے وہ آزاد تھا کہ جب چاہے اور چاہے تو ساری رات سڑکوں پر ہی گھومتا رہے۔

تھوڑی دیر میں دفتروں سے کلرکوں کی ٹولیاں نکلنی شروع ہوئیں۔ ان میں ٹائپسٹ' ریکارڈ کیپر' ڈسپیچر' اکاؤنٹنٹ' ہیڈ کلرک' سپرنٹنڈنٹ غرض ادنیٰ واعلیٰ ہر درجہ اور حیثیت کے کلرک تھے اور اسی لحاظ سے ان کی وضع قطع بھی ایک دوسرے سے جدا تھی۔ مگر بعض ٹائپسٹ خاص طور پر نمایاں تھے۔ سائیکل سوار آدھی آستینوں کی قمیض' خاکی زین کے نیکر اور چپل پہنے' سر پر سولا ہیٹ رکھے' کلائی پر

گھڑی باندھے رنگ دار چشمہ لگائے بڑی بڑی توندوں والے بابو چھاتا کھولے منہ میں بیڑی بغلوں میں فائلوں کے گٹھے دبائے' ان فائلوں کو وہ قریب قریب ہر روز اس امید میں ساتھ لے جاتے کہ جو گتھیاں وہ دفتر کے غل غپاڑے میں نہیں سلجھا سکے ممکن ہے گھر کی یکسوئی میں ان کا کوئی حال سوجھ جائے۔ مگر گھر پہنچتے ہی وہ گرہستی کے کاموں میں ایسے الجھ جاتے کہ انہیں دیکھنے کا موقع نہ ملتا اور اگلے روز انہیں یہ مفت کا بوجھ جوں کا توں واپس لے آنا پڑتا۔

بعض منچلے تانگے' سائیکل اور چھاتے سے بے نیاز' ٹوپی ہاتھ میں کوٹ کاندھے پر' گریبان کھلا ہوا جسے بٹن ٹوٹ جانے پر انہوں نے سیفٹی پن سے بند کرنے کی کوشش کی تھی اور جس کے نیچے سے چھاتی کے گھنے بال پسینے میں تر بتر نظر آتے تھے۔ نئے رنگروٹ سستے سلے سلائے ڈھیلے ڈھالے بدقطع سوٹ پہنے۔ اس گرمی کے عالم میں واسکٹ اور نکٹائی کالر تک سے لیس کوٹ کی بالائی جیب میں دو دو تین تین فونٹین پین اور پنسلیں لگائے خراماں خراماں چلے آرہے تھے۔

گو ان میں سے زیادہ تر کلرکوں کی مادری زبان ایک ہی تھی مگر وہ لہجہ بگاڑ بگاڑ کر غیر زبان میں باتیں کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ اس کی وجہ وہ طمانیت نہ تھی جو کسی غیر زبان پر قدرت حاصل ہونے پر اس میں غیر زبان میں بولنا پڑتا تھا اور اس وقت وہ باہم بات چیت کر کے اس کی مشق بہم پہنچا رہے تھے۔

ان کلرکوں میں ہر عمر کے لوگ تھے۔ ایسے کم عمر بھولے بھالے ناتجربہ کار بھی جن کی ابھی مسیں بھی پوری نہیں بھیگی تھیں اور جنہیں ابھی سکول سے نکلے تین مہینے بھی نہیں ہوئے تھے اور ایسے عمر رسیدہ جہاں دیدہ گھاگ بھی جنکی ناک پر سالہا سال عینک کے استعمال کے باعث گہرا نشان پڑ گیا تھا اور جنہیں اس سڑک کے اتار چڑھاؤ دیکھتے دیکھتے پچیس پچیس تیس تیس برس ہو چکے تھے۔ بیشتر کارکنوں کی پیٹھ میں گدی سے ذرا نیچے خم سا آ گیا تھا اور کند استروں سے متواتر ڈاڑھی مونڈتے رہنے کے باعث ان کے گالوں اور ٹھوڑی پر بالوں میں جڑیں پھوٹ نکلی تھیں جنہوں نے بے شمار ننھی ننھی پھنسیوں کی شکل اختیار کر لی تھی۔

پیدل چلنے والوں میں بہتیرے لوگ بخوبی جانتے تھے کہ دفتر سے ان کے گھر کو جتنے راستے جاتے ہیں ان کا فاصلہ کے ہزار قدم ہے۔ ہر شخص افسروں کے چڑچڑے پن یا ماتحتوں کی نالائقی پر نالاں نظر آتا تھا۔

ایک تانگے کی سواریوں میں ایک کی کمی دیکھ شریف حسین لپک کر اس میں سوار ہو گیا۔ تانگہ چلا اور تھوڑی دیر میں شہر کے دروازے کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ شریف حسین نے اکنی نکال کر کوچوان کو دی اور گھر کے بجائے شہر کی جامع مسجد کی طرف چل پڑا جس کی سیڑھیوں کے گرداگرد ہر روز شام کو کہنہ فروشوں اور سستا مال بیچنے والوں کی دکانیں سجا کرتی تھیں اور میلہ سا لگا رہتا تھا۔ دنیا بھر

کی چیزیں اور ہر وضع اور ہر قماش کے لوگ یہاں ملتے ہیں۔ اگر مقصد خرید وفروخت نہ ہوتو بھی یہاں اور لوگوں کو چیزیں خریدتے' مول تول کرتے دیکھنا بجائے خود ایک پر لطف تماشا تھا۔

شریف حسین لیکچر باز حکیموں' سنیاسیوں' تعویذ گنڈے بیچنے والے سیانوں اور کھڑے کھڑے تصویر اتارنے دینے والے فوٹو گرافروں کے جمگھٹوں کے پاس ایک ایک دو دو منٹ رکتا' سیر دیکھتا اس طرف جا نکلا جہاں کباڑیوں کی دکانیں تھیں۔ یہاں اسے مختلف قسم کی بے شمار چیزیں نظر آئیں ان میں سے بعض ایسی تھیں جو اپنی اصلی حالت میں بلاشبہ صنعت کا اعلیٰ نمونہ ہوں گی۔ مگر ان کباڑیوں کے ہاتھ پڑتے پڑتے یا تو ان کی صورت اس قدر مسخ ہوگئی کہ پہچانی نہ جاتی تھی۔ یا ان کا کوئی حصہ ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ جس سے چوکھٹے' گراموفون کے کل پرزے جراحی کے آلات' ستار بھس بھرا ہرن' پیتل کے لم ڈھینگ' بدھ کا نیم قد مجسمہ.....

ایک دکان پر اس کی نظر سنگ مرمر کے ایک ٹکڑے پر پڑی جو معلوم ہوتا تھا کہ مغل بادشاہوں کے کسی مقبرے یا بارہ دری سے اکھاڑ ہ گیا ہے۔ اس کا طول کوئی سوا فٹ تھا اور عرض ایک فٹ۔ شریف حسین نے اس ٹکڑے کو اٹھا کر دیکھا۔ یہ ٹکڑا ایسی نفاست سے تراشا گیا تھا کہ اس نے محض یہ دیکھنے کے لیے کہ بھلا کباڑی اس کے کیا دام بتائے گا' قیمت دریافت کی۔

تین روپے! کباڑی نے اس کے دام کچھ زیادہ نہیں بتائے تھے مگر آخر اسے اس کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اس نے ٹکڑا رکھ دیا اور چلنے لگا۔

''کیوں حضرت چل دیئے؟ آپ بتائیے کیا دیجئے گا؟''

وہ رک گیا۔ اسے یہ ظاہر کرتے ہوئے شرم سی آئی کہ اسے اس چیز کی ضرورت نہ تھی اور اس نے محض اپنے شوق تحقیق کو پورا کرنے کے لئے قیمت پوچھی تھی۔ اس نے سوچا' دام اس قدر کم بتاؤ کہ جو کباڑی کو منظور نہ ہو۔ کم از کم وہ اپنے دل میں یہ تو نہ کہے کہ یہ کوئی کنگلا ہے' جو دکانداروں کا وقت ضائع اور اپنی حرص پوری کرنے آیا ہے۔

''ہم تو ایک روپیہ دیں گے۔'' یہ کہہ کر شریف حسین نے چاہا کہ جلد جلد قدم اٹھاتا ہوا کباڑی کی نظروں سے اوجھل ہو جائے مگر اس نے اس کی مہلت ہی نہ دی۔

''اجی سنئے تو! کچھ زیادہ نہیں دیں گے؟ سوا روپیہ بھی نہیں۔ اچھا لے جائیے۔''

شریف حسین کو اپنے آپ پر غصہ آیا کہ میں نے بارہ آنے کیوں نہ کہے۔ اب لوٹنے کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ قیمت ادا کرنے سے پہلے اس نے مرمریں ٹکڑے کو اٹھا کر دوبارہ دیکھا بھالا کہ اگر ذرا سی بھی نقص نظر آئے تو اس سودے کو منسوخ کر دے مگر وہ ٹکڑا

بے عیب تھا۔ نہ جانے کباڑی نے اسے اس قدر سستا بیچنا کیوں قبول کیا تھا۔

رات کو جب وہ کھلے آسمان کے نیچے اپنے گھر کی چھت پر اکیلا بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا تو اس سنگ مرمر کے ٹکڑے کا ایک مصرف اس کے ذہن میں آیا۔ خدا کے کارخانے عجیب ہیں۔ وہ بڑا غفور الرحیم ہے۔ کیا عجب اس کے دن پھر جائیں۔ وہ کلرک درجہ دوم سے ترقی کر کے سپرنٹنڈنٹ بن جائے اور اس کی تنخواہ چالیس سے بڑھ کر چار سو ہو جائے ...... یہ نہیں تو کم سے کم ہیڈ کلرک ہی سہی۔ پھر اسے ساجھے کے مکان میں رہنے کی ضرورت نہ رہے۔ بلکہ وہ کوئی چھوٹا سا مکان لے لے اور اس مرمریں ٹکڑے پر اپنا نام کندہ کرا کے دروازے کے باہر نصب کر دے۔

مستقبل کی یہ خیالی تصویر اس کے ذہن پر کچھ اس طرح چھا گئی کہ یا وہ اس مرمریں ٹکڑے کو بالکل بے مصرف سمجھتا تھا یا اب اسے ایسا محسوس ہونے لگا گویا ایک عرصے سے اسی قسم کے ٹکڑے کی تلاش میں تھا اور اگر اسے نہ خریدتا تو بڑی بھول ہوتی۔

شروع شروع میں جب وہ ملازم ہوا تھا تو اس کا کام کرنے کا جوش اور ترقی کا ولولہ انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ مگر دو سال کی سعی لاحاصل کے بعد اس کا یہ جوش ماند پڑنے لگا تھا۔ مگر اب سنگ مرمر کے اس ٹکڑے نے گویا اسے پھر سے نئے جوش اور ولولے سے ہمکنار کر دیا۔ اور رفتہ رفتہ اس کے خیالوں میں ہل چل ڈال دی۔ مستقبل کے متعلق طرح طرح کے خوش آئند خیالات ہر روز اس کے دماغ میں چکر لگانے لگے۔ اٹھتے بیٹھتے' سوتے جاگتے' دفتر جاتے' دفتر سے آتے' کوٹھیوں کے باہر لوگوں کے نام بورڈ دیکھ' یہاں تک کہ جب مہینہ ختم ہوا اور اسے تنخواہ ملی تو اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اس سنگ مرمر کے ٹکڑے کو شہر کے ایک مشہور سنگ تراش کے پاس لے گیا جس نے بہت چابکدستی سے اس پر اس کا نام کندہ کر کے کونوں میں چھوٹی چھوٹی خوشنما بیلیں بنا دیں۔

اس سنگ مرمر کے ٹکڑے پر اپنا نام کھدا ہوا دیکھ کر ایک عجیب سی خوشی ہوئی۔ زندگی میں شاید یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے اپنا نام اس قدر جلی حروف میں لکھا ہوا دیکھا ہو۔

سنگ تراش کی دکان سے روانہ ہوا تو بازار میں کئی مرتبہ اس کا جی چاہا کہ کتبہ پر سے اس اخبار کو اتار ڈالے جس میں سنگ تراش نے اسے لپیٹ دیا تھا اور اس پر ایک نظر اور ڈال لے۔ مگر ہر بار ایک نامعلوم حجاب جیسے اس کا ہاتھ پکڑ لیتا۔ شاید وہ چلتوں کی نگاہوں سے ڈرتا تھا کہ کہیں وہ اس کتبہ کو دیکھ کر اس کے ان خیالات کو نہ بھانپ جائیں جو پچھلے کئی دنوں سے اس کے دماغ پر مسلط تھے۔

گھر کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہی اس نے اخبار اتار پھینکا اور نظریں کتبہ کی دلکش تحریر پر گاڑے دھیرے دھیرے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ بالائی منزل میں اپنے مکان کے دروازے کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ جیب سے چابی نکالی۔ قفل کھولنے لگا۔ پچھلے دو برس

میں آج پہلی مرتبہ اس پر انکشاف ہوا کہ اس کے مکان کے دروازے کے باہر ایسی کوئی جگہ ہی نہیں کہ اس پر بورڈ لگایا جا سکے۔ اگر جگہ ہوتی بھی تو اس قسم کے کتبے وہاں تھوڑا ہی لگائے جاتے ہیں۔ ان کے لئے تو بڑا مکان چاہیے۔ جس کے پھاٹک کے باہر لگایا جائے تو آتے جاتے کی نظر بھی پڑے۔

قفل کھول کر مکان کے اندر پہنچا اور سوچنے لگا کہ فی الحال اس کتبہ کو کہاں رکھوں۔ اس کے حصہ مکان میں دو کوٹھریاں' ایک غسل خانہ اور ایک باورچی خانہ تھا۔ الماری صرف ایک کوٹھڑی میں تھی مگر اس کے کواڑ نہیں تھے۔ بالآخر اس نے کتبہ کو اسی بے کواڑ کی الماری میں رکھ دیا۔

ہر روز شام کو جب وہ دفتر سے تھکا ہارا واپس آتا تو سب سے پہلے اس کی نظر اس کتبہ ہی پر پڑتی۔ امیدیں اسے سبز باغ دکھاتیں اور دفتر کی مشقت کی تکان کسی قدر کم ہو جاتی۔ دفتر میں جب کبھی اس کا کوئی ساتھی کسی معاملے میں اس کی رہنمائی کا جویا ہوتا تو اپنی برتری کے احساس سے اس کی آنکھیں چمک اٹھتیں۔ جب کبھی کسی ساتھی کی ترقی کی خبر سنتا آرزوئیں اس کے سینے میں ہیجان پیدا کر دیتیں افسر کی ایک ایک نگاہ لطف و کرم کا نشہ اسے آٹھ آٹھ دن رہتا۔

جب تک اس کے بیوی بچے نہیں آئے وہ اپنے خیالوں ہی میں مگن رہا۔ نہ دوستوں سے ملتا' نہ کھیل تماشوں میں حصہ لیتا۔ رات کو جلد ہی ہوٹل سے کھانا کھا کر گھر آ جاتا اور سونے سے پہلے گھنٹوں عجیب عجیب خیالی دنیاؤں میں رہتا مگر ان کے آنے کی دیر تھی کہ نہ تو وہ فراغت ہی رہی اور نہ وہ سکون ہی ملا۔ ایک بار پھر گرہستی کے فکروں نے اسے ایسا گھیر لیا کہ مستقبل کی یہ سہانی تصویریں رفتہ رفتہ دھندلی پڑ گئیں۔

کتبہ سال بھر تک اسی بے کواڑ کی الماری میں پڑا رہا۔ اس عرصے میں اس نے نہایت محنت سے کام کیا۔ اپنے افسروں کو خوش رکھنے کی انتہائی کوشش کی مگر اس کی حالت میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔

اب اس کے بیٹے کی عمر چار برس کی ہو گئی تھی اور اس کا ہاتھ اس بے کواڑ کی الماری تک بخوبی پہنچ جاتا تھا۔ شریف حسین نے اس خیال سے کہ کہیں اس کا بیٹا کتبہ کو گرا نہ دے اسے وہاں سے اٹھا لیا اور اپنے صندوق میں کپڑوں کے نیچے رکھ دیا۔

ساری سردیاں یہ کتبہ اس صندوق میں پڑا رہا۔ جب گرمی کا موسم آیا تو اس کی بیوی کو گرم کپڑے رکھنے کے لیے اس کے صندوق میں سے فالتو چیزوں کو نکالنا پڑا۔ چنانچہ دوسری چیزوں کے ساتھ بیوی نے کتبہ بھی نکال کر کاٹھ کے اس پرانے بکس میں ڈال دیا جس میں ٹوٹے ہوئے چوکھٹے' بے بال کے برش' بیکار صابن دانیاں' ٹوٹے ہوئے کھلونے اور ایسی ہی اور دوسری چیزیں پڑی رہتی تھیں۔

شریف حسین نے اب اپنے مستقبل کے متعلق زیادہ سوچنا چھوڑ دیا تھا۔ دفتروں کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر وہ اس نتیجہ پر پہنچ گیا تھا کہ ترقی لطیفہ غیبی سے نصیب ہوتی ہے۔ کڑی محنت جھیلنے اور جان کھپانے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اس کی تنخواہ میں ہر دوسرے برس تین روپے کا اضافہ ہو جاتا تھا جس سے بچوں کی تعلیم وغیرہ کا خرچ نکل آتا اور اسے زیادہ تنگی نہ اٹھانا پڑتی۔

پے در پے مایوسیوں کے بعد جب اس کو ملازمت کرتے بارہ برس ہو چکے تھے اور اس کے دل سے رفتہ رفتہ ترقی کے تمام ولولے نکل چکے تھے اور کتبہ کی یاد تک ذہن سے محو ہو چکی تھی تو اس کے افسروں نے اس کی دیانتداری اور پرانی کارگزاری کا خیال کر کے اسے تین مہینے کے لئے عارضی طور پر درجہ اول کے ایک کلرک کی جگہ دے دی جو چھٹی جانا چاہتا تھا۔

جس روز اسے یہ عہدہ ملا اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اس نے تانگے کا بھی انتظار نہ کیا بلکہ تیز تیز قدم اٹھاتا پیدل ہی بیوی کو یہ مژدہ سنانے چل دیا۔ شاید تانگہ اسے کچھ زیادہ جلدی گھر نہ پہنچا سکتا۔

اگلے مہینے اس نے نیلام گھر سے ایک سستی لکھنے کی میز اور ایک گھومنے والی کرسی خریدی۔ میز کے آتے ہی اسے پھر کتبہ کی یاد آئی اور اس کے ساتھ ہی اس کی سوئی ہوئی امنگیں جاگ اٹھیں۔ اس نے ڈھونڈ ڈھانڈ کے کاٹھ کی پیٹی میں سے کتبہ نکالا۔ صابن سے دھویا پونچھا اور دیوار کے سہارے میز پر ٹکا دیا۔

یہ زمانہ اس کے لیے بہت کٹھن تھا کیونکہ وہ اپنے افسروں کو اپنی برتر کارگزاری دکھانے کے لیے چھٹی پر گئے ہوئے کلرک سے دگنا کام کرتا۔ اپنے ماتحتوں کو خوش رکھنے کے لیے بہت سا ان کا کام بھی کر دیتا۔ گھر پر آدھی رات تک فائلوں میں غرق رہتا۔ پھر بھی وہ خوش تھا۔ ہاں جب کبھی اسے اس کلرک کی واپسی کا خیال آتا تو اس کا دل بجھ سا جاتا۔ کبھی کبھی وہ سوچتا ممکن ہے وہ اپنی چھٹی کی معیاد بڑھوا لے۔ ممکن ہے وہ بیمار پڑ جائے، ممکن ہے وہ کبھی نہ آئے۔

مگر جب تین مہینے گزر گئے تو نہ تو اس کلرک کی چھٹی نے معیاد ہی بڑھوائی اور نہ ہی بیمار پڑا البتہ شریف حسین کو اپنی پرانی جگہ پر آ جانا پڑا۔

اس کے بعد جو دن گزرے وہ اس کے لیے بڑی مایوسی اور افسردگی کے تھے۔ تھوڑی سی خوشحالی کی جھلک دیکھ لینے کے بعد اب اسے اپنی حالت پہلے سے بھی زیادہ ابتر معلوم ہونے لگی تھی۔ اس کا جی کام میں مطلق نہ لگتا تھا۔ مزاج میں آلکس اور حرکات میں سستی سی پیدا ہونے لگی۔ ہر وقت بیزار بیزار سا رہتا۔ نہ کبھی ہنستا نہ کسی سے بولتا چالتا۔ مگر یہ کیفیت چند دن سے زیادہ نہ رہی۔ افسروں کے تیور جلد ہی اسے راہ راست پر لے آئے۔

اب کا اس کا بڑا لڑکا چھٹی میں پڑھتا تھا اور چھوٹا چوتھی میں اور منجھلی لڑکی ماں سے قرآن مجید پڑھتی' سینا پرونا سیکھتی اور گھر کے کام کاج میں اس کا ہاتھ بٹاتی۔ باپ کی میز کرسی پر بڑے لڑکے نے قبضہ جمالیا۔ وہاں بیٹھ کر وہ سکول کا کام کیا کرتا۔ چونکہ میز کے ہلنے سے کتبہ گر جانے کا خدشہ رہتا تھا اور پھر اس نے میز کیک بہت سی جگہ بھی گھیر رکھی تھی اس لئے لڑکے نے اسے اٹھا کر پھر اسی بے کواڑ کی الماری میں رکھ دیا۔

سال پر سال گزرتے گئے۔ اس عرصے میں کتبہ نے کئی جگہیں بدلیں۔ کبھی بے کواڑ کی الماری میں تو کبھی میز پر' کبھی صندوقوں کے اوپر تو کبھی چار پائی پر کے نیچے۔ کبھی بوری میں تو کبھی کاٹھ کے بکس میں۔ ایک دفعہ کسی نے اٹھا کر باورچی خانے کے اس بڑے طاق میں رکھ دیا جس میں روزمرہ کے استعمال کے برتن رکھے رہتے تھے۔ شریف حسین کی نظر پڑ گئی' دیکھا تو دھوئیں سے اس کا سفید رنگ پیلا پڑ چلا تھا۔ اٹھا کر دھویا پونچھا اور پھر بے کواڑ کی الماری میں رکھ دیا مگر چند ہی روز میں اسے پھر غائب کر دیا گیا اور اس کی جگہ وہاں کاغذی پھولوں کے بڑے بڑے گملے رکھ دیئے گئے جو شریف حسین کے بڑے بیٹے کے کسی دوست نے اسے تحفے میں دیئے تھے۔ رنگ پیلا پڑ جانے سے کتبہ الماری میں رکھا ہوا بدنما معلوم ہوتا تھا۔ مگر اب کاغذی پھولوں کے سرخ سرخ رنگوں سے الماری میں جیسے جان پڑ گئی تھی اور ساری کوٹھڑی دہک اٹھی تھی۔

اب شریف حسین کو ملازم ہوئے پورے بیس سال گزر چکے تھے۔ اس کے سر کے بال نصف سے زیادہ سفید ہو چکے تھے اور پیٹھ میں گدی سے ذرا نیچے خم آ گیا تھا۔ اب بھی کبھی اس کے دماغ میں خوشحالی و فارغ البالی کے خیالات چکر لگاتے مگر اب ان کی کیفیت پہلے کی سی نہیں تھی کہ خواہ وہ کوئی کام کر رہا ہو تصورات کا ایک تسلسل ہے کہ پہروں ٹوٹنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ اب اکثر اوقات ایک آدھ دم بھر میں ان تصورات کو اڑا لے جاتی اور پھر بیٹی کی شادی' لڑکوں کی تعلیم' اس کے بڑھتے ہوئے اخراجات' پھر ساتھ ہی ساتھ ان کے لیے نوکریوں کی تلاش۔ یہ ایسی فکریں نہ تھیں کہ پل بھر کو بھی اس کے خیال کو کسی اور طرف بھٹکنے دیتیں۔

پچپن برس کی عمر میں اسے پنشن مل گئی۔ اب اس کا بڑا بیٹا ریل کے مال گودام میں کام کرتا تھا۔ چھوٹا کسی دفتر میں ٹائپسٹ تھا اور اس سے چھوٹا انٹرنس میں پڑھتا تھا۔ اپنی پنشن اور لڑکوں کی تنخواہیں سب مل ملا کے کوئی ڈیڑھ سو روپے ماہوار کے لگ بھگ آمدنی ہو جاتی تھی جس میں بخوبی گزر ہونے لگی تھی۔ علاوہ ازیں اس کا ارادہ کوئی چھوٹا موٹا بیوپار شروع کرنے کا بھی تھا مگر مندے کے ڈر سے ابھی پورا نہ ہو سکا تھا۔

اپنی کفایت شعاری اور بیوی کی سلیقہ مندی کی بدولت اس نے بڑے بیٹے اور بیٹی کی شادیاں خاصی دھوم دھام سے کر دی تھیں۔

ان ضروری کاموں سے نمٹ کر اس کے جی میں آئی کہ حج کر آئے مگر اس کی توفیق نہ ہو سکی۔ البتہ کچھ دنوں مسجدوں کی رونق خوب بڑھائی مگر پھر جلد ہی بڑھاپے کی کمزوریوں اور بیماریوں نے دبانا شروع کر دیا اور زیادہ تر چارپائی ہی پڑا رہنے لگا۔

جب اسے پنشن وصول کرتے پانچ سال گزر گئے تو جاڑے کی ایک رات کو وہ کسی کام سے بستر سے اٹھا۔ گرم گرم لحاف سے نکلا تھا' پچھلے پہر کی سرد اور تند ہوا تیر کی طرح اس کے سینے میں لگی اور اسے نمونیا ہو گیا۔ بیٹوں نے اس کے بہتیرے علاج معالجے کرائے۔ اس کی بیوی اور بہو دن رات اس کی پٹی سے لگی بیٹھی رہیں مگر افاقہ نہ ہوا اور وہ کوئی چار دن بستر پر پڑے رہنے کے بعد مر گیا۔

اس کی موت کی بعد اس کا بڑا بیٹا مکان کی صفائی کرا رہا تھا کہ پرانے اسباب کا جائزہ لیتے ہوئے ایک بوری میں اسے یہ کتبہ مل گیا۔ بیٹے کو باپ سے بے حد محبت تھی۔ کتبہ پر باپ کا نام دیکھ کر اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو بھر آئے اور وہ دیر تک ایک محویت کے عالم میں اس خطاطی اور نقش نگاری کو دیکھتا رہا۔ اچانک اسے ایک بات سوجھی جس نے اس کی آنکھوں میں چمک پیدا کر دی۔

اگلے روز وہ کتبہ کو ایک سنگ تراش کے پاس لے گیا اور اس سے کتبہ کی عبارت میں تھوڑی سی ترمیم کرائی اور پھر اسی شام اسے اپنے باپ کی قبر پر نصب کر دیا۔



سرخ گلاب

اس کا اپنا گھر تو کوئی تھا ہی نہیں مگر گاؤں کے ہر گھر کو وہ اپنا ہی گھر سمجھتی تھی۔ دن میں وہ کبھی کسی گھر میں دکھائی دیتی کبھی کسی گھر میں۔ کبھی ذیلدار کے ہاں تمبا کو کوٹ رہی ہوتی۔ کبھی شمے گوجر کے ہاں چھاچھ بلو رہی ہوتی۔ کبھی مائی تاباں کے ساتھ اس کی کچی دیوار پر جس نے سارے گاؤں کا احاطہ کر رکھا تھا' اپلے تھاپتی دکھائی دیتی۔ غرض جب دیکھو وہ گاؤں والوں کے کسی نہ کسی کام میں جُتی ہی نظر آتی۔

کسی کسی روز وہ گاؤں والوں کی بکریاں اس پہاڑی پر چرانے لے جاتی جس پر چن شاہ ولی کا مزار تھا اور جہاں پیڑوں اور جھاڑیوں پر رنگ برنگے جھنڈے بارہ مہینے لہرایا کرتے۔ یہ جھنڈے آس پاس کے دیہات کے ان زائرین نے باندھے تھے۔ جن کی مرادیں چن شاہ ولی کے فیض سے پوری ہو گئی تھیں۔

وہ یہ سارے کام ہنسی خوشی کیا کرتی اور صلے کا کبھی خیال تک اس کے ذہن میں نہ آتا۔ کسی نے کچھ روکھا سوکھا دے دیا تو کھا لیا کہیں سے کوئی پھٹا پرانا کپڑا مل گیا تو پہن لیا ورنہ اپنے حال میں مست رہا کرتی۔ اس کی اوڑھنی میں جگہ جگہ چھید تھے جن میں سے اس کے لمبے بھورے بال دھول اور تنکوں سے اٹے ہوئے کسی سادھو کی جٹا کی طرح دکھائی دیتے۔

وہ اسی گاؤں کی ایک نائن کی بیٹی تھی۔ باپ کی اس نے صورت نہیں دیکھی تھی۔ چار برس کی ہوئی تو ماں بھی چل بسی اور کوئی رشتے دار تھا نہیں بس گاؤں ہی میں رل رلا کر پل گئی۔ گاؤں کی ہر عورت خواہ ذیلدارنی یا مہترانی اس کی ''چاچی'' تھی اور گاؤں کا ہر مرد اس کا ''چاچا''

پندرہ برس کی عمر کو پہنچ کر اس نے خوب ہاتھ پاؤں نکالے۔ روپ بھی نکھر آیا۔ آنکھیں بڑی بڑی اور رسیلی جیسی ہرنیوں کی' شروع شروع میں جس کسی نے دیکھا حیران رہ گیا اور دل میں کہنے لگا۔ ''ارے یہ وہی نائن کی چندھی لونڈیا کا کی ہے جو چھ سات برس ادھر ننگ دھڑنگ نالیوں میں لوٹا کرتی تھی۔''

کا کی کی عمر چار پانچ برس ہی کی تھی کہ اس میں مجذوبیت کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ اگر ماں باپ زندہ ہوتے تو شاید اس کے علاج کی کچھ فکر کرتے۔ یا کم سے کم اسے شعور کی باتیں ہی سکھاتے۔ گاؤں والوں کو تو اس کی پرواہ تھی نہ ضرورت۔ ان کی ہمدردی تو

بس یہیں تک تھی کہ کبھی کبھی اس کے ہاتھ میں گڑ کی بھیلی یا گاجر پکڑا دی۔ وہ جوں جوں بڑی ہوتی گئی اس کے اور اعضاء تو نشوونما پاتے رہے مگر دماغ کمزور ہی رہا۔ جوانی کو پہنچ کر بھی وہ مجذوب کی مجذوب ہی رہی۔ مگر اس کا یہ مرض گاؤں والوں کے لیے بڑے فائدے کا موجب تھا۔ کیونکہ وہ دن بھر اس سے طرح طرح کے کام لیتے رہتے جنہیں وہ ناسمجھی میں بے تکان کرتی رہتی۔

کاکی نے اپنے دماغ کی کمزوری کے باوجود ایک بات میں بڑی ترقی کی تھی وہ یہ کہ اس کی زبان خوب چلنے لگی تھی جس گھر میں جاتی اپنی اوٹ پٹانگ باتوں سے اس کے مکینوں کا دماغ چاٹ جایا کرتی۔ جب بات کرنے کو کوئی نہ ملتا تو آپ ہی آپ بولتی رہتی۔ کبھی کبھی اسے مارا پیٹا بھی جاتا مگر جلد ہی گھر کی کوئی بڑی بوڑھی اپنی میٹھی میٹھی باتوں سے اسے بہلا لیتی اور یہ خطرہ دور ہو جاتا کہ کہیں وہ ناراض ہو کر اس گھر کا آنا جانا ہی بند کر دے۔

جب کاکی کے کپڑے بہت میلے ہو جاتے تو پٹواری کی بیوی اسے صابن کا ایک ٹکڑا دے کر کہتی۔ ''کاکی تیرے کپڑوں سے بڑی بدبو آنے لگی ہے۔ جا انگنائی میں بیٹھ کر انہیں دھولے۔'' کاکی انکار کرتی تو پٹواری کی بیوی زبردستی اس کے کپڑے اتروا کر اس سے دھلواتی' شلوار یا کرتہ کہیں سے پھٹا ہوتا تو اسے سوئی دھاگہ دیا جاتا مگر کاکی سینا پرونا نہ جانتی تھی اس پر پٹوارن کو خود ہی اس کے پھٹے ہوئے کپڑے سینے پڑتے مگر اس کے عوض کاکی کو گھنٹوں پٹوارن کی کمر دابنی پڑتی۔

جس روز کاکی گاؤں والوں کی بکریاں چرانے لے جاتی' اسے کسی نہ کسی گھر سے بیسن کی دو روٹیاں اور تھوڑا سا مکھن ایک پوٹلی میں باندھ کر دے دیا جاتا۔ پہاڑی پر پہنچ کر بکریاں اپنے آپ چرتی رہتیں اور وہ خود بھی ان ہی کی طرح ادھر ادھر گھومتی رہتی۔ وہ اونچے اونچے سپاٹ ٹیلوں پر بے دھڑک چڑھ جاتی۔ کبھی کبھی درخت کی اونچی ڈال پر چڑھ بیٹھتی۔ کبھی کسی جھاڑی کے نیچے ٹھنڈی ٹھنڈی زمین پر لیٹ جاتی اور آپ ہی آپ باتیں کرنے لگتی' یا دور سے آتی ہوئی رہٹ کی گھوں گھوں سنتی رہتی۔ کبھی پہاڑی کی چوٹی پر جا پہنچتی۔ جہاں سے ایک طرف چن شاہ ولی کے مقبرے کا سبز گنبد نظر آتا اور دوسرے طرف گاؤں کا بڑا سہانا منظر دکھائی دیتا۔

منالی کی آبادی چار پانچ سو نفوس سے زیادہ نہ تھی۔ یہ ویسا ہی کچے گھروندوں کا بے ترتیب مجموعہ تھا جیسے پنجاب کے اور گاؤں ہوتے ہیں۔ گرداگرد کچی دیوار جس پر اپلے تھپے ہوئے۔ بیچوں بیچ بے ڈھنگی سڑک کہیں سے تنگ کہیں سے کشادہ' پیچ کھاتی اور قریب قریب ہر گھر کے آگے سے گزرتی ہوئی۔ سڑک کے دونوں طرف بیل گاڑیوں کے پہیوں نے مستقل طور پر نالیاں سی بنا دی تھیں۔ جب کیچڑ نہ ہوتی تو ان نالیوں میں پہیے بڑی روانی سے چلتے اور بیلوں کو زور نہ لگانا پڑتا۔ گاؤں کی دیوار پر صبح سے ہی بہت سے کوّے آ بیٹھتے اور دن بھر کائیں کائیں کا شور برپا رکھتے۔ ان کے علاوہ گاؤں کے لڑکے بھی کھدر کے میلے کچیلے کرتے پہنے' ننگی ٹانگیں' بعض

لنگوٹی اور بعض صرف ایک دھاگا سا کمر پر باندھ کر دیوار پر ایک ٹانگ ادھر ایک ٹانگ ادھر گھوڑے کی سواری کرتے نظر آتے۔

منالی میں دو تین مکان پختہ اینٹوں کے بنے ہوئے بھی تھے۔ مگر یہ گاؤں کی دیوار سے باہر کھیتوں کے بیچ میں تھے۔ ان میں ایک مکان تو ذیلدار کا تھا اور دوسرا اس سے ذرا فاصلے پر چھوٹا مکان پٹواری کا۔ کاکی کا آنا جانا زیادہ تر ان ہی دو مکانوں میں رہتا تھا۔

منالی تھا تو چھوٹا سا گاؤں مگر چن شاہ ولی کے مزار کے باعث اس کی شہرت دور دور پھیلی ہوئی تھی۔ ہر سال چیت کی پچیسویں تاریخ کو بڑی دھوم دھام سے عرس منایا جاتا۔ جس میں شامل ہونے کے لئے پچاس پچاس کوس سے زائرین بال بچوں سمیت آیا کرتے تھے۔

چن شاہ بڑے زبردست ولی مانے جاتے تھے۔ مشہور تھا کہ جو کوئی عرس کے روز ان کے مزار پر آ کر مراد مانگے' خاص کر اولاد کی مراد تو وہ جلد ہی یا کچھ عرصے بعد پوری ہو کے رہتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ دیہاتی عورتیں خاص طور پر چن شاہ ولی کی بڑی معتقد تھیں۔ ان کی ایک کرامت یہ بھی تھی کہ مراد مانگنے والی کو پہلے ہی سے معلوم ہو جاتا کہ میری تمنا بر آئے گی یا نہیں۔ اگر بر آنے والی ہوتی تو چن شاہ ولی خود سائلہ کے خواب میں آ کر اس کی بشارت دیتے۔ یہ بشارت کیا تھی؟ سرخ گلاب کا ایک پھول' ولی سفید گھوڑے پر سوار ہاتھ میں تھامے جسے وہ بار بار سونگھتے سائلہ کے پاس سے گزرتے اور وہ پھول اس کی جھولی میں پھینک دیتے۔ آنکھ کھلنے پر جب سائلہ گھر کے لوگوں کو یہ مژدہ سناتی تو سب اسے مبارکباد دینے لگتے۔

چن شاہ ولی کی ان کرامتوں کے تذکرے گاؤں کے ہر گھر میں اکثر ہوتے رہتے تھے۔ کاکی بڑے غور سے ان باتوں کو سنا کرتی۔ کبھی کبھی وہ خود بھی کوئی بات پوچھنے لگتی۔

''اچھا چاچی جب چن شاہ ولی نے تیری جھولی میں پھول پھینکا تو وہ پیدل تھا یا گھوڑے پر؟''

''گھوڑے پر''

''وہ شکل وصورت میں کیسا تھا؟ بڈھا تھا یا جوان؟''

''چپ کر پگلی' کنواری لڑکیاں ایسی باتیں منہ سے نہیں نکالتیں۔''

''کیوں کنواری لڑکیوں کو کیا ہوتا ہے؟''

گھر کی مالکہ کے پاس اس کا کوئی جواب نہ ہوتا اور ادھر کاکی جواب کا انتظار کئے بغیر چن شاہ کے بارے میں کوئی اور بات پوچھنے لگتی اور مالکہ کو خواہ مخواہ کوئی کام پیدا کر کے کاکی کو اس میں الجھا دینا پڑتا۔

تیسرے پہر وہ بکریوں کو ہانکتی ہوئی پہاڑی پر سے اترتی۔ گاؤں میں پہنچ کر بکریاں تو اپنے اپنے ٹھکانے پر خود بہ خود چلی جاتیں اور وہ سیدھی مولے گنڈیری والے کی دکان پر پہنچتی اور اس سے گانٹھیں مانگتی۔ مولا گنڈیریاں تو گنے کے موسم ہی میں بیچا کرتا تھا مگر سارا سال وہ اسی نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ خواہ اس نے گڑ کی ریوڑیوں‘ میٹھے چنوں اور دال موٹھ کا خوانچہ ہی کیوں نہ لگا رکھا ہو۔ یہ شخص سیاہ فام اور بدرو تھا۔ اس پر چیچک میں اس کی ایک آنکھ بھی جاتی رہی تھی۔ چالیس کے قریب عمر تھی۔ دس سال ہوئے اس کی بیوی مر گئی تھی مگر اس نے دوسری شادی نہیں کی تھی۔ بس دن بھر اپنی ایک آنکھ سے گاؤں کی لڑکیوں کو گھورا کرتا۔

وہ کاکی کو اس وقت سے جانتا تھا جب وہ پانچ چھ برس کی بچی تھی اور وہ عموماً ننگی پھرا کرتی تھی۔ اسی وقت سے وہ اس کے پاس گانٹھیں مانگنے آنے لگی تھی۔ کاکی کو دیکھ کر وہ حیران ہوتا کہ لڑکیاں کتنی جلدی جوان ہو جاتی ہیں۔ اس کے ساتھ اس کی نگاہیں کاکی کے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے کپڑوں پر پڑتیں جن میں سے اس کے سڈول گھٹنے یا سفید سینے کا کچھ حصہ دکھائی دے رہا ہوتا اور اس کا دل خواہ مخواہ کاکی سے حجت بازی کرنے کو چاہتا۔

”گانٹھیں نہیں ہیں پھر آنا۔“

”وہ جو پڑی ہیں چاچا تیرے گھٹنے کے نیچے۔“

”یہ میں نے اپنے لیے رکھی ہیں۔“

”تو گنڈیریاں کیوں نہیں چوستا چاچا“

”واہ گنڈیریاں چوسوں تو بیچوں کیا۔ میں کہتا ہوں کاکی تو دن بھر جن لوگوں کے کام کرتی رہتی ہے ان سے پیسے کیوں نہیں مانگتی۔ پھر تو جتنی چاہے گنڈیریاں چوس سکتی ہے۔ گانٹھوں سے تیرے دانت نہیں دکھتے؟“

”نہیں اللہ کی سوں! مجھے گانٹھیں ہی اچھی لگتی ہیں۔ لا چاچا جلدی گانٹھیں دے دے۔ دیر ہو رہی ہے۔“

اور مولا دو چار گانٹھیں اسے دے ہی دیتا۔

چیت کا مہینہ نصف سے زیادہ گزر چکا تھا۔ چن شاہ ولی کے عرس کی تاریخ قریب آ رہی تھی چونکہ یہ عرس ایسے زمانے میں ہوتا جب دیہاتی فصل کی کٹائی سے فارغ ہو چکے ہوتے اور اپنی محنتوں کا صلہ پا کر خوشحالی کی ایک ہلکی سے جھلک ان کی زندگیوں میں نظر آنے لگتی۔ اس لئے وہ خوشی خوشی اپنی بساط کے مطابق عرس کی تیاریاں کرنے لگتے۔

چن شاہ کے مزار کا پرانا مجاور جس کا نام جیون سائیں تھا‘ مزار کے آس پاس کی زمین کو جھاڑ جھنکار سے صاف کرتا نظر آنے لگا۔

اس نے گاؤں والوں سے دو جوان مانگے اور ان کی مدد سے مزار کی دیواروں اور برجیوں پر سفیدی کی اور گنبد پر سبز رنگ کیا۔ ادھر گاؤں کی عورتوں میں ہر وقت چن شاہ ولی ہی کا ذکر رہنے لگا۔ وہ ہر روز پہلے سے بھی زیادہ بیتابی کے ساتھ عرس کے دن کا انتظار کرنے لگیں۔

اب کے جن عورتوں کو مراد مانگنی تھی ان میں گاؤں کے ذیلدار کی بیوی بھی تھی جس کا نام خیر النساء تھا۔ وہ ایک موٹی پھسپھسی بدمزاج اور غصہ دار عوت تھی۔ چند مہینوں سے وہ کا کی کو بہلا پھسلا کر زیادہ تر اپنے پاس ہی رکھنے لگی تھی۔ وہ اس سے طرح طرح کی محنت مشقت کے کام لیا کرتی۔ جب عرس کے دن قریب آئے تو اس نے کچھ تو کا کی کی خدمت گزاریوں کے صلے میں اور کچھ مراد مانگنے کی خوشی میں اسے گھٹیا جاپانی ریشم کا ایک سوٹ سلوا دیا۔ جس پر گلاب کے دو بڑے بڑے پھول چھپے ہوئے تھے۔

جب عرس کا دن آیا تو خیر النساء نے کا کی کو گرم پانی سے خوب نہلوایا۔ گھر کی ایک بوڑھی عورت نے اس کے سر پر سرسوں کا تیل ڈال کر کنگھی کی اور ایک چٹلا اس کی چوٹی میں گوندھ دیا گیا جو اس کے بھورے بالوں پر خوب سجنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں کاجل ڈالا گیا۔ ریشمی کپڑوں اور بناؤ سنگھار سے اس کا روپ کئی گنا بڑھ گیا اور وہ کسی زمیندار کی بہو بیٹی معلوم ہونے لگی۔

''کا کی!'' ذیلدارنی نے کہا ''تو میرے ساتھ ساتھ ہی رہیو۔''

''اچھا چاچی''

''جانے کن کن گاؤں سے لوگ آئیں گے۔ ان میں شریف بھی ہوں گے' بدمعاش بھی اور کہیں کوئی تجھے بھگا لے جائے۔''

''نہیں چاچی''

''اور جب میں مزار پر دعا مانگنے بیٹھوں تو تو بھی میرے پاس ہی بیٹھ جائیو۔''

''چاچی تیرے تو اولاد ہے تو مراد کیوں مانگے گی؟''

''میرے اب لڑکیاں ہی ہوئی ہیں۔ میری تمنا ہے چن شاہ ولی مجھے ایک چاند سا بیٹا بھی دیں۔''

کا کی کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

''چاچی میں بھی مراد مانگوں؟''

''ہٹ پگلی تیرا ابھی بیاہ ہی کب ہوا ہے؟''

''تو میرا بیاہ کب ہوگا؟''

''چپ کم بخت کیسی باتیں منہ سے نکالتی ہے۔''

کاکی کچھ اور پوچھنا چاہتی تھی کہ خیر النساء نے زور سے اس کی چٹیا کھینچ کر اسے چپ کرا دیا۔

چن شاہ ولی کا مزار زیادہ دور نہیں تھا۔ اس لئے ذیلدارنی کاکی اور چند رشتہ دار عورتوں کے ساتھ پیدل ہی پہاڑی کی طرف روانہ ہوگئی۔

اس روز ابھی تڑکا ہی تھا کہ دور دور کے گاؤں سے عورتوں اور بچوں سے بھری ہوئی بیل گاڑیاں آنی شروع ہوگئی تھیں۔ مرد ساتھ ساتھ پیدل چل رہے تھے۔ ان میں کچھ گھوڑوں پر بھی سوار تھے۔ یہ گاؤں کے بانکے سجیلے نوجوان تھے۔ رنگ دار لنگیاں باندھے بوسکی کی قمیضیں پہنے چاندی کے بٹن لگائے خواہ مخواہ گھوڑے کو ایڑ بتاتے اور تخ تخ کرتے چلے آتے تھے۔ کبھی یہ بھی دیکھنے میں آتا کہ میاں آگے گھوڑے پر بیٹھا ہے' بیوی پیچھے بیٹھی ہے۔ بیوی نے ایک ہاتھ سے میاں کی کمر پکڑ رکھی ہے اور دوسرے ہاتھ سے بچے کو سہارا دے رکھا ہے جو دونوں کے بیچ ماں کی چھاتی سے چمٹا دودھ پی رہا ہے۔

بہت سی عورتیں جن کے گاؤں قریب ہی تھے ٹولیاں بنا کر پیدل آرہی تھیں۔ ان میں ہر عمر کی عورتیں تھیں۔ نئی نویلیاں پور پور مہندی رچی ہوئی' سرخ جوڑا سرخ دوپٹہ جس میں چنٹیں پڑی ہوئی' کناروں پر گوٹا لگا ہوا۔ ہونٹ کثرت سے دنداسہ ملنے سے سیاہی مائل پیازی ہوگئے تھے اور آنکھوں سے کاجل بہا جاتا تھا۔ ادھیڑ عمر کی دیہاتنیں' لمبی تڑنگی' ان کی اور ہی وضع تھی۔ موٹی ململ کے کرتے کھدر کی شلواریں جنہیں ہلکا ہلکا نیل دیا ہوا۔ سر اور سینے کو لٹھے کی چادر میں چھپائے' چلتے وقت ان کی گردن سیدھی اور نگاہیں سامنے رہتی تھیں۔ یہ عادت انہیں سالہا سال سر پر بدنے اور مٹکے یا اناج کی گٹھڑیاں بغیر ہاتھوں کے سہارے اٹھا کر چلنے کے باعث آپ ہی آپ پڑ گئی تھی۔

مزار سے ذرا فاصلے پر ایک جگہ کو ہموار کر کے میدان سا بنا لیا گیا تھا۔ جہاں لنگر کی دیگیں چڑھا دی گئی تھیں۔ آس پاس کے چھوٹے چھوٹے قصبوں سے کچھ دکاندار سستے کھلونے لے آئے تھے اور زمین پر چادر بچھا کر دکانیں سجا دی تھیں۔ کچھ لوگ بانس کی چھتریوں پر غبارے' پھرکیاں' پپیے' بھونپو وغیرہ دھاگوں سے لٹکائے خود بین باجہ بجاتے ہوئے میلے کی رونق بڑھا رہے تھے۔

ایک طرف پہاڑی کے نیچے چرخ اور گنڈولے گڑے تھے۔ جن کی چرخ چوں سے پیہم ایک گونج سی سنائی دے رہی تھی۔ بچوں کے علاوہ خاصی بڑی عمر والے مرد بھی چرخ پر بیٹھے شور وغل مچا رہے تھے۔ کبھی کبھی دو چار منچلی عورتیں بھی ہنڈولوں میں بیٹھ جاتیں اور جب ہنڈولا اوپر آسمان کی طرف جاتا تو وہ ڈر کر چیخنے لگتیں اور اپنے بچوں کو اور بھی بھینچ کر سینوں سے چمٹا لیتیں۔ کئی پیڑوں میں

جھولے پڑے تھے۔ جن میں کہیں عورتیں اور کہیں مرد پینگیں بڑھا رہے تھے۔

سہ پہر ہوتے ہوتے اتنی مخلوق جمع ہو گئی کہ پہاڑی پر چلنا پھرنا مشکل ہو گیا۔ زمین کے علاوہ پہاڑی کے سب پیڑوں کی ڈالوں پر بھی آدمی ہی آدمی نظر آنے لگے۔ جو زائرین مراد مانگنے آئے تھے' وہ پہاڑی پر چڑھ کر مزار کے اندر پہنچتے اور قبر کے سرہانے یا پائنتی جہاں بھی جگہ مل جاتی بیٹھ کر خضوع و خشوع کے ساتھ دعا میں مشغول ہو جاتے۔ قبر پر سبز رنگ کی نئی ریشمی چادر ڈال دی گئی۔ زائرین پھول اور چڑھاوے اسی پر چڑھاتے تھے۔

ذیلدارنی نے اپنے قافلے کے ساتھ ایک گھنے پیڑ کے نیچے ڈیرا جمایا تھا۔ وہ شام کے قریب پھولوں کی چادر' لڈو اور نذر کی دوسری چیزیں لے کر مراد مانگنے گئی۔ کاکی اور دو ایک عورتیں اس کے ہمراہ تھیں۔ قبر کے سرہانے تھوڑی سی خالی جگہ دیکھ کر انہوں نے جلدی سے اس پر قبضہ جمالیا اور ٹھنس ٹھنسا کر وہیں بیٹھ گئیں پھر ذیلدارنی اور دوسری عورتوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ کاکی نے بھی ان کی پیروی کی اور منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگی۔ آخر دعا ختم ہوئی اور یہ عورتیں مزار سے نکل کر پھر اسی پیڑ کے نیچے اپنے ٹھکانے پر پہنچ گئیں۔

اب شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ ہر چند گیسوں کا انتظام کیا گیا تھا مگر ان کی تعداد دو تین سے زیادہ نہ تھی۔ ایک گیس مزار کی کوٹھڑی کے باہر صحن میں رکھا گیا تھا۔ ایک پہاڑی راستے کے بیچوں بیچ تاکہ زائرین کو ٹھوکر نہ لگے اور ایک اس جگہ جہاں لنگر تقسیم کیا جانا تھا۔ باقی تمام جگہوں پر تیل کی کپیاں چراغ یا مشعلیں جلائی گئی تھیں۔ کچھ لوگ گھر سے لالٹین لے آئے تھے۔ وہ بھی کہیں کہیں روشن تھیں مگر ان سب کی روشنی اتنی مدھم تھی کہ ہر طرف نیم تاریکی چھائی ہوئی تھی۔

رسم کے مطابق سب زائرین کو رات یہیں گزارنی تھی۔ دیہات کے لوگ اور خاص طور پر عورتیں رات کو جلد ہی سو جانے کی عادی ہوتی ہیں۔ اس پر میلہ دیکھنے اور گھومنے پھرنے سے وہ تھک کر چور ہو گئی تھیں۔ بعض نے تو لنگر کا بھی انتظار نہ کیا اور دریوں اور چٹائیوں پر جہاں جگہ ملی' پڑ کر سو گئیں۔

رات کو نو بجے کے قریب لنگر تقسیم کیا گیا اور میلے میں ایک مرتبہ پھر چہل پہل پیدا ہو گئی۔ آخر دس بجتے بجتے یہ ہنگامہ بھی ختم ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی زائرین کی بیشتر تعداد کو نیند نے بے سدھ کر دیا۔

کاکی ذیلدارنی کے پائنتی لیٹی ہوئی تھی۔ عرس کی ریل پیل' ہنگامے' کھیل کود' شور و غل' بھانت بھانت کی صورتیں' عورتوں کا چن شاہ ولی کے مزار پر جانا اور اولاد کی مراد مانگنا' دن بھر یہ سب تماشے دیکھ دیکھ کر اس کے کمزور دماغ میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا تھا۔ جس سے اس کی نیند اڑ گئی تھی۔ کچھ دیر تو وہ یونہی پڑی رہی۔ پھر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ پہاڑی پر اب بھی کہیں کہیں لوگ ہنس بول رہے تھے۔ ایک

طرف ذرا فاصلے پر ملنگوں کی منڈلی جمی ہوئی تھی اور کچھ لوگ مٹکے کی لے کے ساتھ گا رہے تھے۔

''چل سنتاں دے سنگ نی جے توہوناں سنت نی''

اس منڈلی سے بار بار ایک شعلہ اندھیرے میں لپکتا اور لمحہ بھر کو بعض شکلوں کا اجاگر کر دیتا۔ کاکی کچھ دیر یہ منظر دیکھتی رہی۔ پھر وہ اٹھ کھڑی ہوگئی۔ اس وقت ذیلدارنی اور دوسری عورتیں نیند میں مدہوش تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی اس منڈلی کی طرف جانے لگی۔ جب ذرا قریب پہنچی تو ایک گرے ہوئے درخت کا تنا نظر آیا اور وہ اس پر بیٹھ گئی۔ یہاں سے اسے وہ شعلہ زیادہ روشن اور اوپر اٹھتا ہوا دکھائی دینے لگا اور وہ پہلے سے بھی زیادہ انہماک کے ساتھ یہ تماشہ دیکھنے لگی۔

تھوڑی دیر میں اس منڈلی میں سے ایک آدمی اٹھا اور زور زور سے کھانستا ہوا اس طرف آنے لگا جدھر کاکی درخت کے تنے پر بیٹھی تھی۔ کاکی نے اسے جھٹ پہچان لیا۔

''چاچا مولا تو یہاں کیا کر رہا ہے؟''

''تو کون ہے؟''

''واہ مجھے نہیں پہچانا؟''

مولے نے اپنی واحد آنکھ کو ملا اور بے اختیار بول اٹھا ''اوہو ہو' بھئی واہ یہ تو اپنی کاکی ہے۔''

اس نے کاکی کو ہمیشہ برے حال میں دیکھا تھا مگر اب اس کا یہ رنگ ڈھنگ دیکھ کر وہ ہکا بکا رہ گیا۔

''بھئی رب کی سوں' کاکی تو ان کپڑوں میں بڑی خوبصورت لگ رہی ہے۔''

''چاچا یہ کپڑے ذیلدارنی نے سلوائے ہیں۔''

''اچھا' شاباش ہے بھئی''

''چاچا تجھے ایک بات بتاؤں؟''

''بتا''

''جب ذیلدارنی نے لڑکے کی مراد مانگی تو میں نے بھی لڑکے کی دعا مانگی۔ آہاہا جی۔ چاچا یہ بات ذیلدارنی کو نہ بتانا۔''

مولے نے کچھ جواب نہ دیا۔ اس کا دماغ کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ عین اس وقت منڈلی سے پھر ایک شعلہ لپکا۔ کاکی اسے دیکھتے ہی چلا اٹھی۔

''چاچا یہ آگ سی کیا نکلتی ہے؟''

''کون سی آگ؟''

''وہ دیکھو پھر نکلی۔''

اس اثناء میں کئی شعلے پے درپے لپکے' مولے نے دیکھا تو مسکرانے لگا۔

''اس کو لاٹ کہتے ہیں پگلی' تو نے یہ لاٹ پہلے کبھی نہیں دیکھی؟''

''کبھی نہیں' چاچا چل مجھے دکھا۔''

مولا گھبرا سا گیا۔

''آج نہیں پھر کبھی سہی۔''

''نہیں' میں آج ہی دیکھوں گی''

''اچھا ٹھہر'' اس کے جسم میں ایک کپکپی سی دوڑ رہی تھی۔ ''ایک شرط ہے۔''

''کیا؟''

''کسی کو بتائے گی تو نہیں؟''

''کبھی نہیں''

''قسم کھا چن شاہ ولی کی۔''

''چن شاہ کی سوں' کسی کو نہیں بتاؤں گی۔''

''یاد رکھ' تو نے قسم توڑ دی تو چن شاہ ولی تجھ پر غصے ہوگا اور تیری مراد کبھی پوری نہیں کرے گا۔''

''کہہ جو دیا چاچا نہیں بتاؤں گی۔''

''اچھا تو ٹھہر' میں وہ لاٹ یہیں لاتا ہوں۔''

علی الصبح ذیلدارنی کا کی کو جو دری سے ذرا ہٹ کر زمین پر بے ہوش پڑی تھی' جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر اٹھا رہی تھی مگر اس کی آنکھ کھلنے میں نہ آتی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ کہتی جاتی۔

''نکھندی نے ایک ہی دن میں زمین پر لوٹ لوٹ کر کپڑوں کا کیا ناس کر دیا۔ اری اٹھتی ہے یا دوں ایک لات؟''

''اٹھتی ہوں چاچی''

آخر بڑی مشکل سے کاکی نے اپنی آنکھیں کھولیں' جو اس وقت بہت سرخ ہو رہی تھیں۔

''او شدنی اٹھ' میلہ ختم ہو گیا۔ سب لوگ جا رہے ہیں۔ جلدی سے برتن سنبھال۔ دری لپیٹ۔ ذیلدار صاحب انتظار کر رہے ہوں گے۔''

کاکی کا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا' پیاس سے حلق سوکھ رہا تھا۔ وہ جیسے تیسے اٹھی مگر کھڑی ہوئی تو ٹانگیں لڑکھڑانے لگیں۔ گرتی پڑتی درخت کے تنے کے پاس پہنچی۔ جہاں پانی کی مٹکی رکھی تھی اور لوٹا بھر کر پانی پیا۔ پھر منہ پر چھینٹے دیئے۔ رفتہ رفتہ اس کے حواس درست ہونے لگے۔

چن شاہ ولی کے عرس کو ابھی ایک مہینہ ہی گزرا تھا کہ گاؤں کی عورتوں نے کاکی کے مزاج میں ایک تبدیلی دیکھی۔ وہ یہ کہ اسے کھانے پینے کی رغبت نہ رہی۔ کہاں تو ایسی پیٹو کہ دن بھر میں کئی کئی مرتبہ کھانا کھاتی اور چھاچھ کے گڑوے کے گڑوے پی ڈالتی' یا اب یہ حال کہ کھانا دیکھ کر اسے متلی ہونے لگتی۔ ویسے بھی دن رات ابکائیاں آتی رہتیں۔ یہ کیفیت چار پانچ ہفتے تک رہی۔ اس کے بعد منالی کی عورتیں یہ دیکھ کر دم بخود رہ گئیں کہ کاکی کا پیٹ روز بروز پھولتا جا رہا ہے۔

سب سے پہلے ذیلدارنی پر اس حقیقت کا انکشاف ہوا۔

''او کاکی کی بچی تجھے تو حمل ہے کم بخت''

ذیلدارنی کی بات اس کی سمجھ میں نہ آئی اور وہ حیوانوں کی طرح اس کا منہ تکنے لگی۔

''کاکی سچ سچ بتا تو کس آدمی سے ملی تھی؟''

''کسی سے بھی نہیں چاچی''

''تو پھر رنڈی یہ حرام کا بچہ تیرے پیٹ میں کیسا ہے؟''

''میرے پیٹ میں بچہ ہے چاچی؟'' یکبارگی کاکی کی آنکھیں روشن ہو گئیں۔ ''تو سچ کہتی ہے چاچی؟ آہا پھر تو چن شاہ ولی نے میری مراد پوری کر دی۔''

دو چار دن میں یہ خبر سارے گاؤں میں پھیل گئی۔ وہ جس طرف بھی جاتی مرد اس کو گھورتے اور عورتیں اس پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دیتیں مگر کاکی کو اب نہ جھڑکیوں کا ڈر تھا نہ مار پیٹ کا خوف۔ اس پر اب ہر وقت ایک جذب کی کیفیت طاری رہنے لگی۔ وہ اکثر اپنے

آپ باتیں کرتی رہتی۔ کبھی اس طرح خطاب کرنے لگتی جیسے کوئی اس کے سامنے کھڑا ہے جس کو وہ تو دیکھ رہی ہے مگر کوئی اور نہیں دیکھ پاتا۔ کبھی ہنسنے لگتی تو ہنسے ہی چلی جاتی اور رونے لگتی تو گھنٹوں روتی ہی رہتی۔ گاؤں کے اکثر گھروں میں اب بھی اس کا پھیرا رہتا۔ مگر کہیں چند منٹ سے زیادہ نہ ٹکتی۔ کبھی آپ ہی آپ کہہ اٹھتی۔

''ہاں چاچی میرے پیٹ میں بچہ ہے۔ مجھے چمن شاہ ولی نے دیا ہے۔ وہ اس رات میرے پاس آیا تھا۔ اس نے دانتوں میں سرخ گلاب کا پھول داب رکھا تھا مجھے دیکھا تو مسکرانے لگا پھر اس نے وہ پھول میری جھولی میں پھینک دیا۔''

اور شمے گوجر کی بیوی سے جو ہمیشہ اس سے شفقت سے پیش آتی تھی' اس نے کہا۔ ''چمن شاہ ولی ہر رات میرے پاس آتا ہے۔ ایک دفعہ وہ اپنے سفید گھوڑے پر سوار تھا۔ میں نے کہا' چمن شاہ ولی مجھے سیر کرا۔ اس نے کہا' اچھا۔ پھر اس نے مجھے اپنے پیچھے بٹھا لیا اور دور دور کی سیر کرائی۔ اس کا گھوڑا دریاؤں کے اوپر چلتا' پہاڑوں پر چڑھتا تھا' آسمان پر اڑتا تھا۔ میں نے چمن شاہ ولی کی کمر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ رکھا تھا۔ چمن شاہ نے کہا' کاکی ڈر نہیں تو گرے گی تو نہیں۔''

اور پٹواری کی نئی بیوی سے جو عمر میں کاکی سے تین چار سال ہی بڑی تھی' اس نے کہا۔ ''تجھے پتہ نہیں ہے چاچی چمن شاہ ولی بڈھا نہیں نہ اس کے داڑھی ہے وہ بڑا گھبرو جوان ہے۔ اس کے لمبے لمبے گھنگھریالے بال ہیں۔ جو اس کے شانوں پر لٹکتے ہیں۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگا۔ کاکی تیرے بال بڑے الجھے ہوئے ہیں' لا میں انہیں سلجھا دوں اور وہ اپنی انگلیوں سے میرے بالوں میں کنگھی کرنے لگا۔''

کبھی کبھی وہ مولے گنڈیری والے کی دکان پر بھی جاتی۔

''چاچا مولا دیکھا چمن شاہ ولی نے میری مراد پوری کر دی۔ لا تھوڑی سی گنڈیریاں تو دے۔''

مولے کے چہرے کا رنگ یکبارگی زرد پڑ جاتا اور وہ گھبراہٹ میں بہت سی گنڈیریاں اس کی جھولی میں ڈال دیتا۔

ایک دن وہ ذیلدارنی کے گھر پہنچی۔ تو خیر النساء نے پہلے تو اسے سینکڑوں گالیاں دیں پھر چٹیا پکڑ کر خوب گھسیٹا اور بہت سی لاتیں اور تھپڑ بھی رسید کیے۔

''خبردار رنڈی اگر پھر کبھی گھر میں قدم رکھا۔''

''چاچی'' کاکی نے بلک بلک کر روتے ہوئے کہا۔ ''تو نے مجھے مارا ہے۔ رات چمن شاہ آئے گا تو میں اس سے کہوں گی۔ ذیلدارنی بہت بری ہے۔ اس کی مراد کبھی پوری نہ کرنا۔''

اور پھر گاؤں والوں نے پنچایت کی جس میں گاؤں کے سب چھوٹے بڑے شامل ہوئے اور فیصلہ کیا گیا کہ چونکہ کاکی کی وجہ سے گاؤں کی سخت بدنامی ہو رہی ہے اس لئے اسے گاؤں سے نکال دیا جائے۔

اس فیصلے کو عمل میں لانے کے لئے علی الصبح ایک بیل گاڑی کا انتظام کیا گیا اور اس میں کاکی کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے سوار کر دیا گیا۔

یہ بیل گاڑی دن بھر نامعلوم راہوں سے گزرتی رہی اور شام کو ایک اجاڑ مقام پر پہنچ کر رک گئی۔ وہاں کاکی کے ہاتھ پاؤں کھول دیئے گے اور اسے زبردستی بیل گاڑی سے اتار دیا گیا۔

متالی میں کچھ دنوں اس واقعہ کا چرچا رہا مگر جب دو تین مہینے گزر گئے اور کاکی کو نہ تو کسی نے دیکھا اور نہ اس کی کوئی خبر ہی آئی تو یہ بات آپ سے آپ گاؤں والوں کے ذہن سے اتر گئی۔

دن پر دن گزرتے گئے یہاں تک کہ پھر چیت کا مہینہ آیا۔ زمین سے ہر طرف پھر بہار کی مہک اٹھنے لگی۔ کسان فصلوں کی کٹائی سے فارغ ہونے اور ایک بار پھر چن شاہ ولی کے عرس کی تیاریاں ہونے لگیں۔

پچھلے برس خیر النساء کی مراد تو پوری نہیں ہوئی تھی مگر اسی گاؤں کی دو عورتوں پر چن شاہ کی نظر کرم ہو گئی۔ ذیلدارنی کو اپنی محرومی کا رنج تو بہت تھا مگر وہ مایوس نہیں ہوئی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اب کے چن شاہ ولی ضرور خواب میں اپنا دیدار کرائیں گے۔ آخر عرس کا دن آن پہنچا۔ اس دفعہ پچھلے سال سے بھی زیادہ زور شور سے میلہ بھرا۔ شام کو چن شاہ ولی کی قبر پر مراد مانگنے والی عورتوں کا اس قدر جمگھٹ ہو گیا کہ سانس لینا مشکل تھا۔ مگر یہ فرط عقیدت سے اور بھی قبر پر پلی پڑتی تھی ان کا خیال تھا ہم جس قدر زیادہ تکلیف اٹھائیں گے اسی قدر جلد ہماری مراد پوری ہو گی۔

اس ہجوم میں خیر النساء بھی ولی کی قبر کے سرہانے بیٹھی تھی۔ وہ چڑھاوا چڑھا چکی تھی اور بہت منت وزاری سے بیٹے کے لیے دعا مانگ چکی تھی۔ وہ درگاہ سے اٹھنے ہی کو تھی کہ ایک عورت جس کی وضع فقیرنیوں کی سی تھی۔ ہجوم کو چیرتی ہوئی قبر کے قریب پہنچنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کی گود میں تین چار مہینے کا بچہ تھا' دبلا پتلا ہڈیوں کی مالا۔ وہ یا تو سو رہا تھا یا اس میں اتنی سکت ہی نہ تھی کہ آنکھ کھولے۔

اس عورت کی نظر جیسے ہی خیر النساء پر پڑی۔ اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

''دیکھ او رذیلدارنی میرا بیٹا دیکھ' یہ مجھے چن شاہ نے دیا ہے۔

یہ کہہ کر اس نے اپنا بچہ بڑے فخر سے خیر النساء کو دکھایا۔ ذیلدارنی نے کاکی کو فوراً پہچان لیا۔

''او بے حیا بے شرم یہ تو ہے' دور ہو یہاں سے حرام کا پلا لے کر۔''

''آہاہاہا تو مجھ سے جلتی ہے ذیلدارنی۔ کیونکہ چن شاہ نے تجھے بیٹا نہیں دیا۔ اس نے مجھے بیٹا دیا۔ آہاہاہا''

کاکی کے چہرے سے وحشیانہ خوشی ظاہر ہو رہی تھی۔ ذیلدارنی غصے سے کانپنے لگی۔ اس نے چاہا کہ آگے بڑھ کر کاکی کا منہ نوچ لے۔ مگر درمیان میں کئی عورتیں حائل تھیں جو حیرت سے کبھی ذیلدارنی کا منہ تکتی تھیں اور کبھی کاکی کا۔

''ٹھہر تو جا رنڈی' ابھی تجھے اس گاؤں سے پھر نکلواتی ہوں۔ اب کے تیرا سر مونڈھا جائے گا اور تیرا منہ کالا کر کے تجھے گدھے پر سوار کیا جائے گا۔''

مگر کاکی پر ذیلدارنی کی ان دھمکیوں کا کچھ اثر نہ ہوا وہ خیر النساء کو چڑانے کے لیے برابر کہے جا رہی تھی۔

''تو مجھ سے جلتی ہے ذیلدارنی! کیونکہ چن شاہ ولی تیرے پاس راتوں کو نہیں آتا۔ وہ تیرے بالوں میں اپنی انگلیوں سے کنگھی نہیں کرتا۔ وہ تجھے اپنے سفید گھوڑے پر بٹھا کر آسمان کی سیر نہیں کراتا۔ تو ہمیشہ جلی بھنی رہے گی ذیلدارنی۔ چن شاہ تجھے کبھی بیٹا نہیں دے گا۔''

وہ عورتیں جو پہلے تعجب سے کاکی کو دیکھ رہی تھیں اور جن میں سے بعض کو شاید اس سے کچھ کچھ ہمدردی بھی پیدا ہو گئی تھی' اس کی زبان سے اب چن شاہ ولی کی شان میں گستاخانہ باتیں سن کر دانتوں سے اپنی انگلیاں کاٹنے لگیں۔

اتنے میں درگاہ کا متولی جیون سائیں جو باہر دالان میں چٹائی پر بیٹھا تھا' شور سن کر اندر آ گیا۔ ذیلدارنی نے اسے دیکھتے ہی چلانا شروع کیا۔ ''دیکھ سائیں بابا! یہ کاکی بے حیا نہ جانے کہاں سے حرام کا پلا لے آئی ہے اور درگاہ کی بے ادبی کر رہی ہے۔ اسے چٹیا سے پکڑ کر باہر نکال دے۔''

جیون سائیں تھا تو ادھیڑ عمر مگر خوب ہٹا کٹا۔ وہ آگے بڑھا ہی تھا کہ کاکی نے سہم کر چیخ ماری۔ ''چن شاہ! یہ لوگ مجھے مار رہے ہیں' مجھے بچا' مجھے بچا۔''

مگر کوئی اس کی مدد کو نہ پہنچا۔ ادھر جیون سائیں عورتوں کو آگے سے ہٹاتا ہوا قریب آتا جا رہا تھا۔ اچانک کاکی نے گود کے بچے کو جو ابھی تک سویا ہوا تھا' چن شاہ ولی کی قبر کے نرم نرم پھولوں پر لٹا دیا اور خود ایک ہرنی کی طرح طرارہ بھر درگاہ سے نکل بھاگی۔

اس کی یہ حرکت ایسی غیر متوقع تھی کہ سب لوگ دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ آخر ذیلدارنی اور دو تین عورتوں نے ''پکڑ لو پکڑ لو'' کا شور مچایا۔ اس پر کچھ دیہاتی کاکی کے پیچھے بھاگے مگر وہ کودتی پھاندتی پہاڑی کے ایک ایسے ٹیلے پر چڑھ گئی جو بالکل سپاٹ تھا اور جس

پر چڑھنا سخت خطرناک سمجھا جاتا تھا۔ لوگ دیر تک نیچے کھڑے اسے دیکھتے رہے مگر کسی کو اس کے پیچھے جانے کی جرات نہ ہوئی۔ آخر دو ایک منچلے نوجوانوں نے ہمت کی مگر ابھی انہوں نے آدھا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ کاکی نے ٹیلے کے دوسری طرف پہنچ کر' جس کے نیچے ایک کھائی تھی' بے جھجک چھلانگ لگا دی۔ شاید اسے کچھ چوٹ آ گئی تھی۔ کیونکہ وہ کچھ دیر زمین پر بیٹھی رہی۔ آخر وہاں سے اٹھی اور اس طرف کا رخ کیا جہاں سے کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ فصل کی کٹائی کے بعد یہ جگہ اب کھلا میدان بن گئی تھی۔ اب گاؤں سے کئی آدمی اسے پکڑنے کے لئے دوڑ پڑے تھے مگر وہ ان کے آگے آگے ہی رہی۔ ہاں ایک دفعہ دو آدمیوں نے اسے پکڑ ہی لیا ہوتا مگر اس میں نہ جانے کہاں سے ایک منہ زور گھوڑی کی سی طاقت آ گئی تھی کہ اس نے جھٹک کر اپنے ہاتھ چھڑا لیے اور پھر تیزی سے بھاگنا شروع کر دیا۔

ساری رات اس کا تعاقب جاری رہا۔ صبح کو جب سورج نکل رہا تھا تو وہ ایک میدان میں اپنا پیچھا کرنے والوں میں ایسی گھر گئی کہ فرار کی کوئی صورت نہ رہی۔ جب اسے پکڑا گیا تو وہ ایک درندے کی طرح ہانپ رہی تھی۔ خاردار جھاڑیوں میں الجھ الجھ کر اس کے کپڑوں کی دھجیاں اڑ گئی تھیں اور اب اس کے جسم پر ایک تار بھی نہ رہا تھا۔ اسے کئی آدمیوں نے دبوچ رکھا تھا۔ ایک آدمی اپنے سر سے پگڑی اتار کر اس کے ہاتھ باندھنے لگا۔ وہ پہلے تو چپ چاپ اپنے ہاتھ بندھتے دیکھتی رہی پھر یکبارگی جوش آیا اور اس نے وحشیانہ جدوجہد سے اپنے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ اس پر اس نے اس شخص کی طرف جس نے اس کے ہاتھ باندھے تھے' غضبناک نظروں سے دیکھا اور پھر پیشتر اس کے کہ وہ کچھ مدافعت کر سکے' اچک کر اس کا کان اپنے دانتوں میں لے لیا اور چبا ڈالا۔



جواری

پولیس نے ایسی ہوشیاری سے چھاپہ مارا تھا کہ ان میں سے ایک بھی بچ کر نہیں نکل سکا تھا اور پھر جاتا بھی تو کہاں' بیٹھک کا ایک ہی زینہ تھا جس پر پولیس کے سپاہیوں نے پہلے ہی قبضہ جما لیا تھا۔ رہی کھڑکی' اگر کوئی منچلا جان کی پرواہ نہ کر کے اس میں سے کود بھی پڑتا تو اول تو اس کے گھٹنے ہی سلامت نہ رہتے اور بالفرض زیادہ چوٹ نہ آتی تو بھی اسے بھاگنے کا موقع نہ ملتا کیونکہ پولیس کے نصف درجن سپاہی نیچے بازار میں بیٹھک کو گھیرے ہوئے تھے۔ اور یوں وہ سب کے سب جواری جن کی تعداد دس تھی' پکڑ لیے گئے تھے۔

اتفاق سے اس دن جو جواری اس بیٹھک میں آئے تھے ان میں دو ایک پیشہ وروں کو چھوڑ کر باقی سب کبھی کبھار کے شوقیہ کھیلنے والے تھے اور یوں بھی عزت دار اور آسودہ حال تھے' ایک ٹھیکہ دار تھا۔ ایک سرکاری دفتر کا عہدہ دار' ایک مہاجن کا بیٹا تھا۔ ایک لاری ڈرائیور تھا اور ایک شخص چمڑے کا کاروبار کرتا تھا۔

ان میں دو شخص ایسے بھی تھے جو بے گناہ پکڑے گئے تھے۔ ان میں ایک تو من سکھ پنواڑی تھا۔ ہر چند وہ کبھی کبھی کھیل بھی لیا کرتا تھا مگر اس شام وہ قطعاً اس مقصد سے وہاں نہیں گیا تھا۔ وہ دکان پر ایک دوست کو بٹھا کر دس کے نوٹ کی ریزگاری لینے آیا تھا۔ ریزگاری لے چکا تو چلتے چلتے ایک کھلاڑی کے پتوں پر نظر پڑ گئی' پتے غیر معمولی طور پر اچھے تھے۔ یہ دیکھنے کو کہ وہ کھلاڑی کیا چال چلتا ہے۔ یہ ذرا کی ذرا رکا تھا کہ اتنے میں پولیس آ گئی۔ بس پھر کہاں جا سکتا تھا۔

دوسرا شخص ایک عمر رسیدہ وثیقہ نویس تھا جو ٹھیکہ دار کو ڈھونڈتا ڈھونڈتا اس بیٹھک میں پہنچ گیا تھا۔ ٹھیکیدار سے اس کی پرانی صاحب سلامت تھی اور وہ چاہتا تھا کہ ٹھیکیدار اس کے بیٹے کو بھی چھوٹا موٹا ٹھیکہ کا کام دلا دیا کرے۔ یہ وثیقہ نویس کئی دن سے ٹھیکہ دار کی تلاش تھی اور نہ اسے اتنے آدمیوں کے سامنے مطلب کی بات کہنے کا یارا۔ ٹھیکہ دار کھیل میں منہمک تھا اور وثیقہ نویس اس سوچ میں کہ وہ کون سی ترکیب ہو سکتی ہے جس سے یہ کھیل گھڑی بھر کے لیے تھم جائے اور دوسرے سب لوگ اٹھ کر باہر چلے جائیں مگر اس قسم کی کوئی صورت اسے نظر نہ آتی تھی۔ ادھر ٹھیکہ دار تھا کہ گھنٹوں سے برابر کھیلے چلا جا رہا تھا۔ آخر وثیقہ نویس مایوس ہو کر چلنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ اتنے ہی میں پولیس آ گئی اور جواریوں کے ساتھ اسے بھی دھر لیا گیا۔

ان دونوں نے اپنی بے گناہی کے بہتیرے ثبوت پیش کئے مگر پولیس نے ایک نہ سنی' باقی کے لوگ پولیس کے اس اچانک

دھاوے سے ایسے دم بخود رہ گئے تھے کہ کسی کے منہ سے ایک لفظ تک نہ نکلا۔ سپاہیوں نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ پہلے سب کو بیٹھک سے نیچے اتارا' پھر ان کے گرد گھیرا ڈال انہیں پیدل تھانے لے چلے۔

یہ بھی غنیمت ہوا کہ جھٹپٹا وقت تھا۔ دھندلکے میں زیادہ لوگوں کی نظر نہ پڑی اور یہ لوگ کوٹ کے کالر یا پگڑی کے شملے میں منہ چھپائے' تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے جلد ہی تھانے پہنچ گئے جہاں تھانیدار کے حکم سے ان سب کو حوالات میں بند کر دیا گیا۔

حوالات کی یکسوئی میں جب ان لوگوں کو تماشائیوں کی استہزا ابھری نظروں اور سپاہیوں کے کڑے تیوروں اور کرخت لہجوں سے امان ملی اور جان پہچان کے لوگوں سے مڈبھیڑ کا خوف بھی نہ رہا تو قدرتی طور پر سب سے پہلے ان کا دھیان بیٹھک کے مالک کی طرف گیا جو ان سب کے ساتھ ہی حوالات میں بند تھا۔ ہر شخص کو اپنی بربادی کا باعث سمجھتا تھا۔ چنانچہ سب کو اس پر سخت غصہ آ رہا تھا۔ اگر یہ شخص احتیاط کو کام میں لاتا' مکان سرائے نہ بنا لیتا کہ ہر ایرا غیرا منہ اٹھائے چلا آ رہا ہے' بیٹھک کے باہر کسی مخبر کا انتظام کرتا' نیز پولیس والوں سے اپنے تعلقات خوشگوار رکھتا تو ان سب لوگوں پر برا وقت کبھی نہ آتا۔

بیٹھک کے مالک کا نام تو خدا جانے کیا تھا مگر سب لوگ اسے نکو نکو کہا کرتے تھے۔ یہ شخص درمیانے قد اور چھریرے بدن کا تھا۔ شربتی آنکھیں جن میں سرے کے ڈورے۔ سفید رنگت چھوٹی چھوٹی مونچھیں' چہرے پر چیچک کے مٹے مٹے سے داغ' دانت پانوں کے کثرت استعمال سے سیاہی مائل سرخ ہو گئے تھے۔ گھنگھریالے بال جو ہر وقت آنولے کے تیل میں بسے رہتے۔ بائیں طرف سے مانگ نکلی ہوئی۔ دائیں طرف کے بال ایک لہر کی صورت میں پیشانی پر پڑے ہوئے ململ کا کرتا جس میں سونے کے بٹن لگے ہوئے' گلے میں چھوٹا سا سونے کا تعویذ' سیاہ ڈورے میں بندھا ہوا' اس کا کرتا ہمیشہ اجلا ہوا مگر دھوتی عموماً میلی' سردیوں میں اس لباس پر ایک پرانا سرخ دوشالہ زری کے حاشیہ والا اوڑھ لیا کرتا۔ اس کی حرکات میں بلا کی پھرتی تھی۔ جتنی دیر میں کوئی مشاق سے مشاق جواری ایک دفعہ تاش پھینٹے اور بانٹے یہ اتنی دیر میں کم سے کم دو دفعہ تاش پھینٹتا اور بانٹ لیتا تھا۔

نکو پہلے ہی اس حملے کے لئے تیار تھا۔ پولیس کے چھاپہ مارنے سے لے کر اس وقت تک تو اس نے چپ سادھے رکھی تھی اور سارے قصے میں اس کا رویہ ایک بیگانے کا سا رہا تھا۔ مگر اب جبکہ سب طرف سے اس پر تیز نظروں کے حملے شروع ہوئے تو اس نے ایک جھرجھری لی اور اپنی مدافعت میں ایک لطیف مسکراہٹ' جس میں خفیف سی شوخی بھی ملی ہوئی تھی' اپنے ہونٹوں پر طاری کی۔ یہ مسکراہٹ چند لمحے قائم رہی۔ پھر اس نے نہایت اطمینان کے ساتھ سب پر ایک نظر ڈالی اور بڑی خود اعتمادی کے لہجہ میں کہا۔

''آپ لوگ بالکل بھی فکر نہ کریں۔ آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ میں سے کسی کا بال بھی بیکا نہ ہوگا۔ میرے ہاں پچھلے پانچ برس

میں آج تک ایسا نہیں ہوا تھا۔ اسے تو' کیا کہنا چاہیے مذاق سمجھو مذاق۔"

جواریوں نے نکو کی اس بات کو سنا پر اس سے ان کے غصے میں ذرا بھی کمی نہ ہوئی۔ بعض نے گردن ہلائی۔ بعض نے بازو جھٹک دیئے۔

"ہوں' مذاق سمجھیں' یہ اچھی رہی۔" ٹھیکیدار نے کہا۔

"لاحول ولا قوۃ......" چمڑے کے سوداگر نے ذرا چمک کر کہا۔ "عجیب آدمی ہو یار' یہاں لاکھ کی عزت خاک میں مل رہی ہے اور تم اسے مذاق بتا رہے ہو۔"

"ناراض کیوں ہوتے ہو شیخ جی' میں نے جو کہا آپ کا بال بھی بیکا نہ ہوگا۔ مونچھوں پر تاؤ دیتے نکلو گے مونچھوں پر تاؤ دیتے۔"

"چل ہٹ لپاڑیا کہیں کا" ٹھیکیدار نے کہا۔

"لپاڑیا کون' میں؟" نکو نے تنک کر کہا۔ "خیر جو جی میں آئے کہہ لو مگر میں پھر کہتا ہوں کہ تم میں سے کسی پر آنچ تک نہ آئے گی۔"

وہ جواری جو کسی سرکاری دفتر میں اکاؤنٹنٹ تھا اسے جوئے سے سخت نفرت تھی مگر جب کبھی اس کی بیوی بچوں کو لے کر میکے جاتی تو اسے اس بیٹھک ہی کی سوجھتی۔ دفتر سے اٹھ کر سیدھا وہیں کا رخ کیا کرتا۔ ہر بار ہارتا اور اپنے کو کوستا' عہد کرتا پھر کبھی نہ آؤں گا۔ مگر اگلے روز سب سے پہلے پہنچتا۔ اس شخص نے نکو کی یہ بات سنی ان سنی کر کے فریاد کے لہجے میں کہنا شروع کیا۔

"ارے بھائی میں لٹ گیا۔ میں سرکاری آدمی' میری عزت دو کوڑی کی ہو گئی۔ ہائے میرے بیوی بچے' نکو تم نے مجھے برباد کر دیا' ہائے۔"

"سنو تو سہی ملک صاحب"

"ارے کیا خاک سنوں' ہائے وہ کون سا منحوس دن تھا جب میں نے تیری صورت دیکھی' ارے یارو میں سرکاری ملازم۔ اگر میرے دفتر والوں کے کان میں بھنک بھی پڑ جائے تو بدنامی' ارے بدنامی کو تو گولی مارو' یہاں پندرہ برس کی ملازمت سے ہاتھ دھونے پڑیں' ہائے میرے بیوی بچے......"

مہاجن کا بیٹا جس نے دولت کمانے کا یہ سہل اور دلچسپ طریقہ نیا نیا سیکھا تھا۔ اب تک بڑے ضبط سے کام لے رہا تھا مگر ملک کا یہ واویلا سن کر یکبارگی ڈھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ سب لوگ اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"صبر کرو چھوٹے شاہ جی صبر کرو۔" نکو نے کہا "تم تو یار عورتوں کی طرح رونے لگے۔ مرد بنو' ارے بھائی یہ تو بات ہی کچھ نہیں

ہے۔"

"میرے پتا جی کو پتا چل گیا۔" مہاجن کے بیٹے نے سسکیاں لے لے کر کہا۔"تو وہ ایک دم مجھے گھر سے نکال دیں گے۔"

"ارے یار چھوڑو بھی' کوئی گھر سے نہ نکالے گا۔" نکو نے کہا۔

"نکو" ملک نے کہا۔"یہ سب تیرا کیا دھرا ہے۔"

"ملک صاحب" نکو نے پرزور لہجہ میں کہا۔"آپ بالکل بھی پریشان نہ ہوں۔آپ میری بات مانیں' میں جو کہہ رہا ہوں کہ آپ پر ذرا آنچ نہیں آئے گی۔یوں نکال لاؤں گا جیسے مکھن میں سے بال نکالتے ہیں۔"

"بس رہنے دے بھائی" ملک نے ملامت آمیز لہجہ میں کہا۔"اگر یہی دم خم تھا تو پولیس کو آنے ہی کیوں دیا ہوتا۔"

"ملک صاحب آپ میری بات مانیں۔میں آپ سے سچ کہتا ہوں۔آپ کا بال بھی بیکا نہ ہوگا بات اصل میں یوں ہے کہ تھانیدار اپنا ہی آدمی ہے۔سمجھے آپ وہ میرا بڑا مہربان ہے۔وہ آپ کو کچھ نہیں کہے گا۔میرے منہ پر تھوک دینا اگر کچھ کہا۔"

نکو کی یہ بات سن کر سب جواری پل بھر کو خاموش کچھ سوچتے رہے۔بعض تو ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کے مصداق اس بات پر یقین کر لینا چاہتے تھے اور بعض کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا۔جیسے وہ کچھ فیصلہ نہیں کر سکے کہ انہیں نکو پر بھروسہ کرنا چاہیے یا نہیں۔البتہ یہ ظاہر ہے کہ رفتہ رفتہ ان کا غصہ اترتا جا رہا تھا۔

"دیکھو نکو" چمڑے والے شیخ جی نے کہا۔"میں سو پچاس کی پروا نہیں کرتا' مگر میری عزت بچ جائے گی۔ویسے بات تو کچھ بھی نہیں ہے اور یوں خود میرا بہنوئی سب انسپکٹر پولیس ہے مگر توبہ توبہ یہ کسی سے کہنے والی بات ہے۔"

"شیخ جی آپ ذرا بھی چنتا نہ کریں۔میں جو کہہ رہا ہوں اسے آپ مذاق ہی سمجھیں۔کبھی کبھی دل لگی کر لیا کرتا ہے میرا یار۔"

"کون؟" من سکھ پٹواری کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔وہ اتنے بڑے بڑے آدمیوں کو اس مصیبت میں اپنا ساجھی دیکھ کر اپنا دکھ بھول گیا تھا۔

"اجی یہی آپ کے تھانیدار صاحب بہادر۔" یہ کہہ کر نکو ہنس پڑا۔

وہ جواری جو لاری چلاتا تھا کونے میں کھڑا کچھ دیر نکو کو بہت غور سے دیکھتا رہا۔پھر اس کے قریب آیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہایت سنجیدگی کے ساتھ کہنے لگا۔

"دیکھو نکو! مجھے صبح سویرے لاری میں خشک میوہ بھر کے دور لے جانا ہے۔ٹھیکیدار میرا انتظار کر رہا ہوگا۔اگر تیری واقعی یہاں

کسی سے واقفیت ہے تو کوئی ایسی ترکیب کر میں صبح سے پہلے پہلے یہاں سے خلاصی پا جاؤں۔"

یوں تو دھیرے دھیرے سبھی لوگ آخر کار نکو کی باتوں پر کان دھرنے لگے تھے مگر اس لاری ڈرائیور نے جس لہجہ میں نکو سے خطاب کیا اس نے قطعی طور پر نکو کے ساتھیوں میں اس کا اقتدار قائم کر دیا۔ نکو نے بھی اسے محسوس کیا اور اپنی اس کامیابی پر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ البتہ لاری ڈرائیور نے جماعت سے علیحدہ ہو کر تنہا اپنی ذات کے لئے جو سفارش کی تھی۔ اس کو سب نے ناپسند کیا اور اسے لاری ڈرائیور کی خود غرضی اور کمینگی پر محمول کیا گیا۔

نکو نے' جس کے لہجہ میں اور بھی زیادہ خود اعتمادی پیدا ہو چکی تھی' لاری ڈرائیور سے بڑے سرپرستانہ انداز میں کہا۔ "مرزا جی' میری جان گھبراؤ نہیں' اس کا بھی انتظام ہو جائے گا۔"

"انتظام ونتظام خاک نہیں ہوگا۔" اچانک وثیقہ نویس نے جھلا کر کہا۔ "مرزا تم بھی اس ڈینگئے کی باتوں میں آ گئے جو سر پر پڑی ہے اسے خود ہی بھگتو۔"

نکو نے وثیقہ نویس کے اس غیر متوقع حملے کو بڑی چابکدستی سے روکا۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

"لو بڑے میاں کی بات سنو۔" اس نے کہا "ہوں' انتظام نہیں ہوگا اور یہاں مال جو کھلایا جاتا ہے ہر مہینے۔ بھائیو میں پھر کہتا ہوں کہ اسے مذاق ہی سمجھو۔ میں ہندو مسلمان والی قسم کھا کے کہتا ہوں کہ کسی کا بال بیکا نہ ہوگا۔ وہ یوں کہ تھانیدار اب کیا بتاؤں تمہیں..." وہ ہنس پڑا" کہ جو دیا اپنا ہی آدمی ہے۔ اب تم کھلوا کے ہی رہو گے۔ پر ذکر وکر نہ کر بیٹھنا کسی سے ورنہ پھنس جاؤ گے۔ میرا دوش نہیں ہوگا۔ وہ بات یوں ہے کہ تھانیدار اب' تم سے کیا چھپاؤں' بھئی میری اس کی رشتہ داری ہے۔ سن لیا' کیوں بڑے میاں اب تو ہو گئی تسلی۔ اتنا نہیں سمجھتے کہ اگر ایسی بات نہ ہوتی تو پچھلے پانچ برس سے اتنے بڑے شہر میں یہ دھندہ بھلا کیسے چلتا رہتا"

نکو نے اپنے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ اقتدار کی عمارت پہلے سے کہیں زیادہ مستحکم ہو چکی تھی۔

ان جواریوں میں ایک شخص تھا جس کے بشرے سے کوئی صدمہ یا رنج ظاہر نہیں ہوتا تھا۔ وہ اس سارے واقعے کے دوران میں بالکل خاموش رہا تھا۔ وہ اٹھائیس برس کا ایک دبلا پتلا نوجوان تھا لباس اور وضع قطع کی طرف سے خاصا بے پرواہ معلوم ہوتا تھا۔ مدت ہوئی اس شخص نے ناتجربہ کاری کی وجہ سے ایک خاصی معقول رقم ہار دی تھی۔ بس اسی دن سے یہ عہد کر رکھا تھا کہ جس روز ہاری ہوئی رقم کو واپس جیت لوں گا جوئے کا پھر کبھی نام نہ لوں گا۔ اس بیٹھک میں آنے سے گھنٹہ دو گھنٹے پہلے کسی باغ میں بیٹھ کر کھیل کا ایک پروگرام سا بنا لیا کرتا۔ چالیس تک سوچ رکھتا' بے حد احتیاط سے کھیلتا نہ تاؤ کھاتا' نہ جوش میں آتا۔ مگر بدقسمتی سے ہاری ہوئی رقم روز بروز بڑھتی

ہی چلی جارہی تھی اور اس کے ساتھ اس کا قرض بھی۔

اس شخص کو رسوائی یا قید اور جرمانے کا تو ذرا غم نہ تھا۔ البتہ اس بات کی فکر ضرور تھی کہ یہ سب کے سب ڈرپوک ہیں' بچ گئے جب بھی اور پھنس گئے جب بھی اس بیٹھک کا رخ نہ کریں گے۔

ادھر نکو نے اب حالات پر پورا قابو پالیا تھا۔ اگرچہ وہ رات رات میں کسی مخلصی کا بھی انتظام نہیں کر سکا تھا۔ تاہم اس نے کسی نہ کسی طرح ہر شخص کو یہ یقین دلا دیا تھا کہ تھانیدار اگر اس کا قریب کا نہیں تو دور کا قرابت دار ضرور ہے اور صبح ہوتے ہی انہیں رہا کر دیا جائے گا۔ چنانچہ سب لوگ زمین پر وہ پھٹے پرانے بدبودار کمبل بچھا کر جو سپاہیوں نے لا دیئے تھے نچنت سے ہو کر پڑ رہے۔

''اوہو غضب ہو گیا۔'' اچانک نکو نے کہا اور وہ لیٹے لیٹے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''کیوں' کیوں خیر تو ہے؟'' اندھیرے میں جواریوں نے پوچھا۔

''بھئی اگر پتا ہوتا کہ یہاں رات کاٹنی پڑے گی تو تاش ساتھ لیتے آتے اور مزے سے ساری رات کھیلتے۔ کہو تو ابھی کسی سپاہی کو بھیج کر تاش اور موم بتی منگا لوں؟''

''نہ نہ بابا معاف کرو'' کئی آوازیں ایک ساتھ سنائی دیں۔

''تم جانو بابا معاف کرو'' کئی آوازیں ایک ساتھ سنائی دیں۔

''تم جانو'' نکو نے بے پروائی سے کہا گویا ایسا نہ کرنے میں انہیں کا نقصان ہے۔ ''ورنہ اچھی خاصی دل لگی رہتی۔ صبح کو تھانیدار کو سناتے تو وہ بھی خوب ہنستا۔''

اگلے روز صبح کو کوئی نو بجے کے قریب ایک سپاہی حوالات کے سلاخ دار دروازے کے باہر آ کھڑا ہوا اور بلند آواز سے پکار کر کہنے لگا۔ ''او جواریو اٹھو تمہاری داروغہ صاحب کے سامنے پیشی ہے۔''

جواری دیر سے اس حکم کے منتظر تھے۔ سب کی نظریں بے اختیار نکو کی طرف اٹھ گئیں۔ نکو نظریں ترچھی کر کے ایک خاص ادا سے مسکرا دیا۔ داروغہ صاحب کے کمرے میں سب نے پہنچتے ہی سلام داغا۔ مگر داروغہ ان کو سرسری نظر دیکھ کر کام میں مصروف ہو گیا۔ اس پر نظر نہیں پڑی یا پھر اس نے دانستہ نظریں پھیر لیں اور وہ سپاہیوں کی بارکوں میں چلا گیا۔

''نکو'' وثیقہ نویس نے طعن آمیز لہجہ میں کہا۔ ''میں جانوں تھانیدار کی تم پر نظر نہیں پڑی ورنہ وہ تمہارے سلام کا جواب ضرور دیتا۔''

''اجی توبہ کرو'' نکو نے کہا ''تھانیدار میرے سلام کا جواب کبھی نہیں دے گا۔ بھائی وہ اس وقت رعب میں ہے' کیا سمجھے!

تھانیداری ہے کچھ مذاق تھوڑا ہی ہے۔ ہم نے سیدھے منہ بات کرتے تو سپاہیوں پر رعب کیسے جمار ہے۔ کل کو یہی سپاہی اس کے ناک چنے نہ چبوادیں اور سپاہی تم جانو مداری کے بندر کی طرح ہوتے ہیں کہ جب تک لاٹھی نظر آتی رہے۔ ڈگڈگی پر ناچتے رہتے ہیں جہاں مداری نے ذرا ڈھیل دی بس لگے ڈینٹھے سر پر سوار ہونے......"

پانچ منٹ کے بعد تھانیدار چند سپاہیوں کے ساتھ باتیں کرتا ہوا بارکوں میں سے نکلا اور ان جواریوں کے پاس پہنچا۔ جب تھانیدار واپس آ رہا تھا تو نکو نے ایک بار پھر سے سلام کیا۔ تھانیدار گھور کر اس کی طرف دیکھا اور پھر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا دفتر میں چلا گیا۔

"کہا تھا نا" نکو نے فتح مندانہ لہجہ میں کہا۔ "میرے سلام کا جواب نہیں دے گا۔ کیوں دیتا جواب؟"

سب جواری خاموش رہے۔

"ایک دن" نکو نے پھر کہنا شروع کیا۔ "تھانے میں بس وہ اور میں ہی تھے کوئی سپاہی آس پاس نہیں تھا۔ بس پھر کیا تھا۔ اتنی گدگدیاں کیں کہ ہنسا ہنسا کے براحال کر دیا۔"

تھانیدار کوئی آدھ گھنٹے تک دفتر کے اندر ہی رہا۔ یہ لوگ پھر صبر ہو چلے تھے کہ اتنے میں وہی سپاہی جس نے صبح آ کر پیشی کی اطلاع دی تھی۔ دفتر سے نکلا اور سیدھا ان کے پاس آ کر اپنے اکھڑے لہجے میں کہنے لگا۔

"او جواریو سنو۔ داروغہ صاحب نے حکم دیا ہے کہ تم سب کے سب دھوتی پاجامہ کھول کے زمین پر ایک قطار میں اوندھے لیٹ جاؤ۔ پھر تم میں سے سرے والا آدمی ایک ایک کر کے اٹھے اور ہر ایک کے دس دس جوتے لگا کے خود سرے سرے پر اوندھا لیٹتا جائے۔ غرض اسی طرح سب کے سب باری باری ہر ایک کے دس دس جوتے لگائیں۔"

تھانیدار کا یہ حکم اتنا غیر متوقع تھا کہ سب جواری ہکا بکا رہ گئے اور سراسیمہ ہو کر سپاہی کا منہ تکنے لگا۔

"الوؤں کی طرح میرا منہ کیا تک رہے ہو۔ اگر حکم سمجھ میں نہ آیا ہو تو پھر سنا دوں؟" یہ کہہ کر جواب کا انتظار کیے بغیر سپاہی نے وہی الفاظ دہرا دیئے۔"

اس پر وثیقہ نویس اور من سکھ پٹواری بے اختیار آگے بڑھ کر سپاہی کے قدموں سے لپٹ گئے۔

"خان صاحب ہم بالکل بے قصور ہیں۔" انہوں نے یک زبان ہو کر گڑگڑا کر کہا۔ "یہ سب لوگ گواہی دیں گے کہ ہم بالکل بے گناہ ہیں۔ جس وقت پولیس آئی ہم نہ تو کھیل رہے تھے اور نہ اس ارادے سے وہاں گئے تھے۔ ہم بے گناہ ہیں۔ خدا جانتا ہے کہ ہم

بالکل بے قصور ہیں۔''

''میں کچھ نہیں کر سکتا۔'' سپاہی نے کہا۔ ''داروغہ صاحب کا حکم یہی ہے۔''

''خان صاحب جی! آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ آپ ہماری طرف سے ہاتھ جوڑ کر حضور سے کہہ دیں کہ ہم دونوں بے گناہ پکڑے گئے ہیں۔ یہ سب لوگ اس بات کی گواہی دیتے ہیں۔''

''میں گواہی واہی کچھ نہیں جانتا۔'' سپاہی نے کہا۔ ''داروغہ صاحب نے سب کے لئے یہی حکم دیا ہے۔ ہاں اور سنو۔ انہوں نے کہا کہ اگر یہ لوگ راضی نہ ہوں تو ان سب کو پھر حوالات میں بند کر دوں گا۔''

وثیقہ نویس اور من سکھ دونوں مایوس ہو کے پھر قطار میں آ کھڑے ہوئے۔ ان کا یہ انجام دیکھ کے کسی جواری کو لب ہلانے کی جرات نہ ہوئی اور وہ سخت پریشان ہو کر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کیا جائے۔ ان کی نظریں بار بار نکو پر پڑتی تھیں۔ مگر وہ ان کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظریں تھانے کے دفتر کی دیواروں پر گڑی ہوئی تھیں جو گویا دیواروں کو چھیدتی ہوئی تھانیدار کو ڈھونڈ نکالنا چاہتی تھیں۔

''دیکھو دیکھو'' سپاہی نے کہا ''تم لوگ دیر کر رہے ہو۔ مجھے مجبوراً تم کو حوالات میں ہی بند کر دینا پڑے گا۔''

اس پر بھی جواری ابھی لیت و لعل ہی کر رہے تھے کہ اچانک کسی کے دھڑام سے زمین پر گرنے کی آواز آئی۔

یہ نکو تھا جو دھوتی کھولے زمین پر اوندھا پڑا تھا۔ اسے اس حال میں دیکھ کر من سکھ کی ہمت بندھی اور اس نے بھی نکو کی پیروی کر ہی دی۔ اکاؤنٹنٹ ملک ادھر ادھر دیکھ رہا تھا کہ سپاہی نے پیچھے سے آ 'گدی سے پکڑ کر زبردستی نیچے بٹھا دیا اور اس نے ناچار اپنے نیکر کے بٹن کھول دیئے۔

سپاہی کے اس سلوک کو دیکھ کر دوسرے جواری آپ ہی آپ زمین پر لیٹ گئے۔ صرف چمڑے والے شیخ جی کھڑے رہ گئے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے اور صورت سے انتہا درجہ کی مظلومی برس رہی تھی۔ ان کا ہاتھ بار بار کمر بند پر پڑتا تھا مگر وہیں رہ جاتا تھا۔

ایسے معزز اور شریف صورت آدمی کو ایسی پریشانی میں دیکھ کر سپاہی کا دل پسیج گیا اور وہ جان بوجھ کر وہاں سے ٹل گیا۔ شیخ جی نے دل کڑا کیا۔ پگڑی کے شملے سے آنسو پونچھے۔ گردن پھرا کر اپنے اردگرد نظر ڈالی اور پھر انتہائی مجبوری کے ساتھ بالآخر انہوں نے بھی تھانیدار کے حکم کی تعمیل کر دی۔

سرے پر لاری ڈرائیور تھا۔ سب سے پہلے جوتے لگانے کی اسی کی باری تھی۔ جس وقت وہ اٹھا تو نکو زور سے کھنکارا ''مرزا جی سنبھل کے'' اس نے کہا ''سب اپنے ہی آدمی ہیں ہاں دیکھنے میں زور کا ہاتھ پڑے مگر...... سمجھ گئے نا......''

لاری ڈرائیور نے ابھی پانچ تک ہی گنتی کی تھی کہ وہی سپاہی تھانے کے دفتر سے نکلا اور اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ ''داروغہ صاحب کہتے ہیں'' اس نے پاس آ کر کہا ''اگر تم لوگوں نے ٹھیک طرح سے جوتے نہ لگائے تو میں اپنے سپاہیوں سے جوتے لگواؤں گا۔'' یہ کہہ کر وہ پھر چلا گیا۔

جواریوں نے مصلحت اسی میں سمجھی کہ خود ہی آپس میں زور زور کے جوتے لگوا لیں۔ چنانچہ کوئی بیس منٹ کے بعد جب ہر ایک نے ہر ایک کے دس دس جوتے لگا لئے تو وہ اس کام سے نمٹ کپڑے جھاڑ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اتنے میں وہی سپاہی پھر آیا اور کہنے لگا ''جاؤ اب کے داروغہ نے تمہارا قصور معاف کر دیا ہے۔ پھر کبھی جوا نہ کھیلنا۔''

یہ لوگ تھانے میں سے یوں نکلے جیسے اپنے کسی بڑے ہی عزیز قریبی رشتہ دار کو دفن کر کے قبرستان سے نکلے ہوں۔ تھانے سے نکل کر کوئی سو گز تک وہ چپ چاپ گردنیں ڈالے چلا کئے) اس کے بعد نکو نے یکبارگی زور کا قہقہہ لگایا۔ اتنے زور کا کہ وہ ہنستے ہنستے دوہرا ہو گیا۔ ''کیوں دیکھا'' اس نے کہا۔ ''نہ چالان' نہ مقدمہ' نہ قید' نہ جرمانہ! میں نہ کہتا تھا اسے مذاق ہی سمجھو۔''



کن رس

بعض لوگوں کو گانے بجانے سے قدرتی لگاؤ ہوتا ہے۔خود چاہے بے خود چاہے بے سرے ہی کیوں نہ ہوں مگر سریلی آواز پر جان دیتے ہیں۔راگ ان پر جادو کا سا اثر کرتا ہے۔رفتہ رفتہ وہ گانے بجانے کے ایسے عادی ہو جاتے ہیں جیسے کسی کو کوئی نشہ لگ جائے۔ صاحب ثروت ہوئے تو عمر بھر گویوں کی پرورش کرتے رہے۔نہیں تو استادوں کی جوتیاں سیدھی کر کے ہی اپنے ذوق کی تسکین کر لے۔دراصل ان ہی لوگوں کے لئے موسیقی روح کی غذا کے مصداق ہوتی ہے۔گانے بجانے والوں کی اصطلاح میں ایسے لوگوں کو ''کن رسیا'' کہتے ہیں۔

فیاض کو بھی قدرت کی طرف سے موسیقی کا کچھ ایسا ہی ذوق عطا ہوا تھا مگر بدقسمتی سے ایک تو وہ پیدا ہی ایک غریب وثیقہ نویس کے گھر ہوا دوسرے اس کا باپ بڑا سخت گیر اور پابند صوم وصلوٰۃ تھا۔نتیجہ یہ ہوا کہ فیاض کا یہ ذوق پنپنے نہ پایا۔پھر بھی اس نے بچپن سے لے کر جوانی تک جیسے تیسے موسیقی سے اپنی دل بستگی قائم رکھی۔

جب اسکول میں پڑھتا تو کبھی کبھی اسے بھی حمد گانے کو کہا جاتا۔وہ بھی عجب سماں ہوتا تھا۔صبح صبح لڑکے قطاریں باندھے کھڑے ہیں اور فیاض ان کے سامنے کھڑا احمد کا ایک ایک مصرعہ گا رہا ہے جسے سارے لڑکے کورس کی صورت میں دہرائے جاتے ہیں۔قوالی اور سماع کی محفلوں میں بھی وہ بچپن ہی سے شریک ہونے لگا تھا کیونکہ باپ ان میں جانے کی اجازت دے دیتا بشرطیکہ وہ پڑوس ہی میں کہیں منعقد ہوتیں۔کبھی کبھی وہ ان براتوں کے ساتھ بھی ہو لیتا جن کے آگے آگے بینڈ باجہ بجتا اور ڈھولکیا زرق برق وردی پر شیر کی کھال پہنے طرح طرح کے کرتبوں سے ڈھول بجاتا جو اس نے گلے میں لٹکا رکھا ہوتا۔وہ جو سڑک کی پٹڑی پر کسی ہنڈے کے نیچے میاں میلی سی چادر بچھا ہارمونیم کھول بیٹھ جاتا اور بیوی ڈھولک گھٹنے تلے دیا گھونگھٹ کے اندر سے کراری کوئل کی سی آواز الاپنے لگتی ہے ان کا گانا بھی فیاض بڑی محویت سے سنا کرتا۔ایسے موقع پر اس کی تمنا ہوتی کہ میں بھی کوئی سستا ہارمونیم خرید لوں اور گھر میں گانے کی مشق کیا کروں۔مگر وہ جانتا تھا کہ باپ کے جیتے جی یہ ارمان پورا ہونا محال ہے۔

طالب علمی ہی کے زمانے میں ایک بار جب اس کے باپ کو کسی ضروری کام سے کسی دوسرے شہر جانا پڑا تھا تو فیاض کا ایک دوست ایک رات اسے تھیٹر دکھانے لے گیا۔یہ پارسیوں کی کوئی مشہور کمپنی تھی جس میں نامی گرامی ایکٹر اور گویے لازمی تھے۔کھیل

بھی ایسا تھا کہ اس میں شروع سے آخر تک گانا ہی گانا تھا۔ فیاض تمام وقت مبہوت ہوکر سنتا رہا اور پھر برسوں اسے اپنے کانوں میں ان نغموں کی گونج سنائی دیتی رہی۔

فیاض نے سکول کی تعلیم ختم کی تو باپ نے تنگدستی کے باوجود اسے کالج میں داخل کرا دیا۔ اس کا خیال تھا کہ لڑکا جتنی زیادہ تعلیم حاصل کرے گا اتنی ہی اچھی اسے نوکری مل جائے گی۔ کالج میں فیاض نے خود کو زیادہ آزاد محسوس کیا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ باپ کی نظروں سے اوجھل رہ کر اسے کالج کی ''بزم موسیقی'' میں اپنے ذوق کی تسکین کا سامان نظر آنے لگا تھا۔

باپ کا قاعدہ تھا کہ رات کو جب تک فیاض بستر پر لیٹ نہ جاتا وہ خود بھی آرام نہ کرتا تھا اور پھر رات کو وہ دو ایک بار اٹھ کر بیٹے کے پلنگ کے پاس ضرور جاتا۔ ایک دفعہ پچھلے پہر اس نے فیاض کو نیند میں بڑبڑاتے سنا۔ وہ اٹھ کر بیٹے کے پلنگ کے پاس گیا۔ فیاض کی زبان سے بے خبری میں عجیب عجیب الفاظ نکل رہے تھے۔ کچھ انگریزی کے کچھ اردو کے۔ بیچ بیچ میں وہ کبھی ٹھنڈی سانسیں بھرنے لگتا کبھی کراہ اٹھتا۔ باپ بڑے تعجب کے ساتھ یہ کیفیات دیکھتا رہا۔ رات بھر وہ طرح طرح کے اندیشوں میں کھویا رہا۔ اگلے ہی روز اس نے بیٹے کے لئے موزوں رشتہ تلاش کرنا شروع کر دیا اور پھر تھوڑے ہی دنوں میں ایک اپنے سے بھی غریب گھر کی مگر شکل صورت کی اچھی لڑکی منتخب کر کے فیاض کی شادی کر دی اور یوں بیٹے کی آوارگی کے امکانات کا بڑی حد تک سدباب کر دیا۔

کالج میں فیاض کا تیسرا سال تھا کہ اچانک باپ کا انتقال ہوگیا۔ ماں اس سے ایک برس پہلے ہی سدھار چکی تھی۔ چنانچہ اب فیاض آزاد تھا مگر یہ آزادی اپنے ساتھ کئی ذمہ داریاں لے کر آئی تھی۔ سب سے اہم مسئلہ اپنی اور اصغری کی جو ایک بچی کی ماں بن چکی تھی' گزر اوقات کا تھا۔ کیونکہ باپ اپنے پیچھے نہ تو کوئی جائیداد ہی چھوڑ کر مرا تھا اور نہ کچھ روپیہ پیسہ ہی۔ چنانچہ اگلے روز اس نے کالج کی بجائے دفتروں کا رخ کیا اور نوکری کی تلاش شروع کر دی۔ اسے اپنی بیوی اور بچی سے بڑی الفت تھی چنانچہ ان کی خاطر اس نے ادنیٰ سے ادنیٰ محنت مزدوری کو بھی اپنے لئے عار نہ سمجھا اور جیسے تیسے ان کا پیٹ پالتا رہا۔ آخر مہینوں سڑکوں کی خاک چھاننے اور دفتروں میں دھکے کھانے کے بعد اسے آبکاری کے محکمے میں ایک کلرک کی جگہ عارضی طور پر مل گئی۔

اس نے دن رات محنت اور اپنی قابلیت سے جلد ہی اس دفتر میں اپنے لئے مستقل جگہ پیدا کر لی۔ اس کے بعد اسے اپنی آمدنی بڑھانے کی فکر ہوئی کیونکہ دوسری بچی کی پیدائش کے ساتھ ہی گھر کے اخراجات بڑھ گئے تھے۔ چنانچہ وہ دن کو دفتر میں کام کرتا اور رات کو گھروں پر جا کر لڑکوں کو پڑھاتا اور اس طرح بڑی مشکل سے گھر کا خرچ چلاتا۔

اس زمانے میں اس کا ذوق موسیقی فائلوں کے انبار اور جمع خرچ کے اندر جات میں گم ہو کے خواب وخیال بن گیا تھا۔ پھر بھی کسی

رات پچھلے پہر کے سناٹے میں اگر وہ جاگ رہا ہوتا اور کوئی تانگے والا سنسان سڑک پر تانگہ چلاتے ہوئے اپنی سریلی اور پاٹ دار آواز میں کوئی لوک گیت گاتا ہوا نکل جاتا تو اس کے دل میں ہوک سی اٹھنے لگتی۔

رفتہ رفتہ اس کی حالت سنبھلتی گئی' یہاں تک کہ دس سال کے عرصے میں وہ اپنی لیاقت' محنت اور خوش اخلاقی کے باعث اسی دفتر میں ہیڈ کلرک بن گیا۔ سب افسر اس کے کام سے خوش تھے اور وہ بھی اپنی حالت پر مطمئن تھا۔ اسے جو مشاہرہ ملتا وہ اس کے اور بیوی بچوں کے گزارے کے لئے کافی تھا اور اب اسے دوسروں کے بچوں کو ان کے گھر پر جا جا کر پڑھانے کی ضرورت نہ رہی تھی۔

جب سے اسے ہیڈ کلرکی ملی تھی اس کا کام خاصا بڑھ گیا تھا۔ اس کا معمول تھا کہ جب سب لوگ دفتر سے چلے جاتے' تو وہ تنہائی میں اپنے ماتحت کلرکوں کے کام کا محاسبہ اور حسابات کی جانچ پڑتال کیا کرتا۔ اس طرح اسے دفتر میں دو ڈھائی گھنٹے زیادہ گزارنے تو پڑتے مگر اس کی دل جمعی ہو جاتی۔ وہ چراغ جلنے سے پہلے شاذ ہی دفتر سے اٹھتا۔ دفتر سے نکل کر وہ اس باغ کا راستہ لیتا جو فصیل کے ساتھ ساتھ شہر کے گردا گرد چلا گیا تھا۔ اس کا گھر شہر کے اندر ایک تنگ اور گنجان آباد محلے میں تھا۔ باغ سے ہو کر گھر پہنچنے میں اسے ایک آدھ میل زیادہ چلنا پڑتا۔ پھر بھی وہ اسے شہر کے پرشور بازاروں اور تنگ گلیوں والے راستے پر ترجیح دیتا۔

وہ باغ کی کشادہ سڑک پر جس پر سرخ بجری بچھی تھی اور جس پر ہر قسم کی گاڑیوں کے چلنے کی ممانعت تھی' مزے مزے سے قدم اٹھاتا خاصی دیر میں گھر پہنچا کرتا۔ اس ہوا خوری سے اس کے دن بھر کے تھکے ہوئے دماغ کو آسودگی حاصل ہوتی اور جس وقت وہ گھر پہنچتا تو خاصا تازہ دم ہوتا۔ اس کے بیوی بچے ملازمت کے ابتدائی زمانے ہی سے اس کے دیر سے گھر پہنچنے کے عادی ہو چکے تھے۔

ایک دفعہ ہفتے کی ایک شام کو وہ معمول سے بھی کچھ زیادہ ہی دیر میں دفتر سے نکلا تھا۔ یہ گلابی جاڑوں کے دن تھے۔ ابر چھایا ہوا تھا اور اکا دکا بوند بھی اس کے منہ پر آ پڑتی تھی۔ وہ حسب عادت باغ کی سڑک پر ٹہلتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ سڑک کے کنارے تھوڑے فاصلے پر بجلی کے کھمبے تھے' جن کی روشنیوں کی قطار سڑک کے ساتھ ساتھ خم کھاتی ہوئی دور سے بڑی بھلی معلوم دیتی تھی۔

فیاض اپنی دھن میں مست چلا جا رہا تھا کہ اچانک اس کے کان میں کسی ساز کے بجنے کی دھیمی دھیمی آواز پڑنی شروع ہوئی۔ وہ جوں جوں آگے بڑھتا گیا آواز زیادہ واضح ہوتی گئی۔ آخر جب وہ قریب پہنچا تو اس نے بجلی کے ہنڈے کی روشنی میں دیکھا کہ سڑک کے قریب ہی باغ کے گوشے میں ایک درخت کے نیچے کوئی شخص فقیروں جیسی گدڑی اوڑھے سرکاری بنچ پر اکڑوں بیٹھا ایک بڑا سا ساز بجا رہا ہے۔

اس موسیقی میں بلا کا سوز تھا۔نغمہ تھا کہ بے اختیار دل میں اترتا جاتا تھا۔رات کی خاموشی میں ایک ایک سر واضح اور الگ الگ سنائی دے رہا تھا۔فیاض کے قدم خود بخود رک گئے اور وہ سازندے پر نظریں جمائے ایک محویت کے عالم میں اس موسیقی کو سننے لگا۔

سازندہ آنکھیں بند کئے اس امر سے بے نیاز کہ کوئی اس کے فن پر دھیان دے رہا ہے یا نہیں بڑے انہماک کے ساتھ ساز بجا رہا تھا۔اس کی انگلیاں تھکنے کا کام نہ لیتی تھیں۔وہ کبھی اس تار پر دوڑتیں کبھی اس تار پر۔دوسرے ہاتھ سے دو تاروں پر ضربیں لگا رہا تھا اس قدر تیزی کے ساتھ کہ فضا میں ایک مسلسل ارتعاش کی کیفیت پیدا ہو رہی تھی۔عجب سماں بندھا ہوا تھا۔

فیاض کے دل و دماغ پر اس موسیقی کا کچھ ایسا اثر پڑا کہ پہلے تو اس کا سانس تیز تیز چلنے لگا۔پھر رفتہ رفتہ اعصاب ڈھیلے پڑنے شروع ہوئے اور نقاہت سی محسوس ہونے لگی۔پھر ایک آنسو اس کی آنکھ سے بے اختیار ٹپک پڑا۔

فیاض کی زندگی کے پچھلے دس گیارہ سال ایسے سپاٹ گزرے تھے کہ ان میں موسیقی یا کسی اور فن لطیفہ کا کچھ دخل نہ رہا تھا۔اس نے اپنی زندگی کا مقصد فقط عزت و آبرو کی روزی کمانا اور بچوں کی پرورش کرنا قرار دے لیا تھا اور وہ یہ فرض بڑا مسرت کے ساتھ انجام دے رہا تھا اور اگر اس کی زندگی میں کسی چیز کی کمی رہ جاتی تھی تو اصغری سے اس کہ والہانہ گرویدگی اس کمی کو پورا کر دیتی تھی مگر اب اس موسیقی کو سن کر اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے دل کے اندر کوئی سوئی ہوئی چیز دفعتاً جاگ اٹھی ہو۔

کچھ دیر کے بعد سازندے نے ساز بجانا بند کر دیا۔اس کے ساتھ ہی فیاض کو ایسا محسوس ہوا کہ جس طلسم نے اسے مسحور کر رکھا تھا وہ ٹوٹ گیا اور اب وہ چاہے تو جا سکتا ہے۔مگر اتنے ہی میں سازندے نے آنکھیں کھول دیں اور پہلی مرتبہ سڑک پر اپنے واحد سامع کو دیکھا۔پھر اس خیال سے کہ کہیں وہ چل نہ دے۔اس نے جلدی سے ہانک لگائی۔

''بابو جی کی خیر ہو مل جائے کوئی دھیلی پاؤ لا فقیر کو نشے پانی کے لئے۔''

فیاض کے قدم رک گئے۔اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔جس میں اتفاق سے اس وقت صرف ایک دونی ہی تھی۔ایسے صاحب کمال کو ایسا حقیر نذرانہ پیش کرتے ہوئے اسے بڑی ندامت محسوس ہوئی۔آخر اس نے سازندے کی طرف بڑھتے ہوئے ہمت کر کے کہا۔''استاد!اس وقت یہی قبول کرو۔ہاں اگر کھانا کھانا ہو تو میرے ساتھ چلو میرا گھر یہاں سے قریب ہی ہے۔''

سازندے نے لحہ بھر تامل کیا۔ساز بجاتے بجاتے یقیناً وہ تھک بھی گیا تھا اور اسے بھوک بھی لگی تھی۔ایسے میں گھر کا پکا پکایا گرم گرم کھانا مل جائے تو کیا برا تھا۔

''چلتا ہوں بابو جی اللہ تمہاری خیر رکھے۔''

اور وہ ساز بغل میں دبا گدڑی سنبھال بیچ سے اٹھ کھڑا ہوا اور فیاض کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ وہ لمبے قد کا دبلا پتلا آدمی تھا۔ ادھیڑ عمر' سر پر لمبی سی ترکی ٹوپی جو بہت میلی ہو گئی تھی اور جس کا پھندنا ٹوٹ چکا تھا۔ لمبے لمبے پٹے جن میں گھاس پھونس کے تنکے الجھے ہوئے تھے۔ کھچڑی داڑھی جو کئی روز سے منڈائی نہیں گئی تھی۔ آنکھیں سرخ سرخ گویا دکھنے آئی ہوں۔ ان میں سے پانی رستا ہوا۔ اس کا لباس جو کرتے' پاجامے اور کالی واسکٹ پر مشتمل تھا' سخت بوسیدہ اور میلا تھا۔ پاؤں میں ٹوٹا ہوا بوٹ جو اس کے پاؤں کے ناپ سے بڑا تھا اور اسے جوتے کو گھسیٹ گھسیٹ کر چلنا پڑتا۔ پیٹھ میں تھوڑا سا کوب۔ جو شاید جھک کر ساز بجانے کی وجہ سے پیدا ہو گیا تھا۔

''یہ باجہ جو تم بجاتے ہو اس کو کیا کہتے ہیں؟'' فیاض نے چلتے چلتے پوچھا۔

''اس کو سرود کہتے ہیں تمہاری خیر رہے' بابو جی''

''سرود؟''

''جی ہاں' سرود''

''بہت کمال کا بجاتے ہو استاد تم تو''

''اجی کمال تو بس اللہ کی ذات کو حاصل ہے بابو جی''

''میں نے آج تک اتنا اچھا ساز بجاتے کسی کو نہیں سنا۔''

''کرم ہے کلیر والے بابا کا۔ میں کس لائق ہوں بابو جی''

''مجھے تو آج تک خبر ہی نہ تھی کہ موسیقی میں اس قدر دلکشی ہوتی ہے۔''

''اجی کیا پوچھتے ہو بابو جی' ایک مرتبہ اس کی چیٹک لگ جائے تو پھر عمر بھر چھٹکارا مشکل ہے۔ مجھی کو دیکھو۔ فقیروں سے بدتر حال ہے۔ کم بخت جی کا جنجال ہو گئی ہے۔''

''کب سے یہ ساز بجا رہے ہو استاد؟''

''کوئی چالیس سال برس کا ریاض ہے بابو جی۔ چار برس کا تھا جب بجانا شروع کیا تھا۔ باوا نے چھوٹا سا بنوا کے دیا تھا کھیلنے کو۔ کیونکہ میں ان کا سرود بجانے کے لئے بہت مچلا کرتا تھا۔ بس میں اپنے اس کھلونے سے کھیلتا رہتا اور اپنے کبھی ٹوں ٹاں بھی کر لیا کرتا۔''

''ایک دن کیا ہوا اللہ تمہاری خیر رکھے بابو جی' کہ صبح ہی صبح استاد دلدار خان مرحوم باوا سے ملنے گھر پر آئے۔ استاد دلدار خان

مرحوم کی سرود کی ساری خدائی میں دھوم تھی مگر اللہ بخشے بچاروں کی الٹے ہاتھ کی کلائی پر چکی کا پاٹ گر پڑا تھا اور ہاتھ بیبی ہو گیا تھا۔ خود بجانے سے معذور ہو گئے۔ بس سکھلایا کرتے تھے۔ وہ بھی راجواڑوں میں۔ باوا سے ان کا بڑا یارانہ تھا۔''

''ہاں تو بابو جی وہ دونوں آنگن میں چارپائی پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ مزے مزے کی باتیں ہو رہی تھیں اور میں ان سے ذرا ہٹ کے زمین پر اپنے اسی کھلونے سے کھیل رہا تھا۔ ایکا ایکی استاد دلدار خان باوا کی بات کاٹ کر چلا اٹھے۔

''اے میاں ذرا سننا' یہ لونڈا کیا بجا رہا ہے؟''

''لو بابو جی' مولا تمہاری خیر رکھے' دونوں نے سنا تو میں گن کری کی گت بجا رہا تھا۔ باوا نے کلام مجید اٹھا لیا کہ میں نے بچے کو بتایا ہو تو اس کی مار پڑے۔ بلکہ میں نے تو اس کے ساز کے کبھی تار بھی ملا کے نہیں دیے۔ اس پر استاد دلدار خان مرحوم باوا سے کہنے لگے ''میاں یہ لونڈا تو تم مجھے دے دو۔ دیکھو میرا ہاتھ بیبی ہو گیا ہے۔ دل میں بہت سی حسرتیں رہ گئی ہیں۔ اب میری جگہ یہ لونڈا دنیا کو بتائے گا کہ دلدار خان کیا چیز تھا۔''

''لو بابو جی' مولا تمہاری خیر رکھے' بڑی حیل حجت ہوئی۔ آخر باوا مان گئے۔ کیونکہ مجھ سے بڑے دو بیٹے اور تھے ان کے۔ استاد مجھے اپنے ساتھ لے آئے۔ بس اس دن سے میں ان کی خدمت میں رہنے لگا۔ چلموں پر آگ رکھتے رکھتے چٹکیاں جل جل گئیں۔ چار چوٹ کی مار مارا کرتے تھے بابو جی مجھے۔ آج جو چار آدمیوں میں میری واہ واہ ہوتی ہے استاد دلدار خان کی جوتیوں ہی کا صدقہ ہے بابو جی۔''

فیاض نے بڑی دلچسپی سے یہ قصہ سنا۔ جب ختم ہوا تو دونوں کچھ دیر چپ چاپ چلتے رہے۔

''تمہارا نام کیا ہے' بابو جی؟'' اچانک سرودیے نے سوال کیا۔

''مجھے فیاض کہتے ہیں۔''

''طبیعت کے بھی ماشاء اللہ فیاض ہو۔ اسم بامسمیٰ۔ اور کام کیا کرتے ہو بابو جی؟''

''میں ایک دفتر میں ملازم ہوں۔''

''تنخواہ کیا ملتی ہے تمہیں بابو جی؟''

''کچھ زیادہ نہیں مگر شکر ہے' گزارا ہو جاتا ہے۔''

''پھر بھی کتنی؟''

''یہی کوئی ڈیڑھ سو۔''

''اور بچے کتنے ہیں؟ ماشاءاللہ سے تمہارے؟''

''دو''

''لڑکے یا لڑکیاں؟''

''لڑکیاں''

یہ سن کر سرودیئے کی زبان سے ایک مہمل سے کلمہ نکلا' پھر وہ کہنے لگا۔ ''خیر جیتی رہیں' اللہ کی دین ہے بابو جی۔۔۔''

فیاض اس کے تابڑتوڑ سوالوں کا جواب دیتے دیتے زچ ہوگیا۔ اس نے اس سلسلے کو روکنے کے لئے خود یہی حربہ استعمال کرنے کی سوچ لی اور خود اس سے سوال کرنے شروع کر دیئے۔ اسے معلوم ہوا کہ سرودیئے کا اصلی نام حیدری خان ہے۔ وہ پیار خان کا چھوٹا بھائی ہے' جو کسی مہاراجہ کے دربار میں ''پان سے'' روپے پر ملازم ہے۔ ایک بڑا بھائی اور تھا۔ وہ بھی کسی راجواڑے میں ملازم تھا مگر کسی نے دشمنی سے اسے زہر دے کر مار ڈالا۔ اپنی بدمزاجی کی وجہ سے اپنے گھر میں کسی سے نہیں بنتی۔ وہ کسی کا دبیل ہو کر نہیں رہ سکتا۔ اس کی طبیعت میں آزادی اور فقیری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا گھر گھاٹ ہے نہ جورو جاتا۔

جس وقت وہ دونوں باغ سے نکل کر فصیل کی ایک گلی سے شہر کے اندر داخل ہوئے تو رات کے کوئی دس بجے کا عمل ہوگا۔ فیاض حیدری خان کے آگے آگے چلتا' راستہ دکھاتا دو تین گلیوں سے گزر کر آخر اسے اپنے بالاخانے کے نیچے لے آیا۔

''استاد تم ذرا یہاں گلی میں ٹھہرو۔'' اس نے کہا۔ ''میں اوپر جا کر پردہ کرا دوں۔''

''بہت دیر نہ لگانا بابو جی' اللہ تمہاری خیر رکھے۔''

فیاض سیڑھیاں چڑھ کر مکان میں پہنچا۔ اس کی بیٹیاں تو سو گئی تھیں مگر اصغری حسب معمول اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔ فیاض نے مختصر الفاظ میں اسے حیدری خان سے ملنے اور اپنے ساتھ لانے کا حال سنایا اور تاکید کی کہ جلدی سے کھانا گرم کر لو۔ پھر وہ لالٹین لے کر نیچے گیا اور حیدری خان کو اوپر بیٹھک میں لے آیا۔ اس گھر میں باورچی خانے کے علاوہ دو کمرے تھے۔ ایک بڑا جس میں وہ' اس کی بیوی اور لڑکیاں سویا کرتی تھیں۔ دوسرا کچھ چھوٹا جو سیڑھیاں چڑھتے ہی سامنے پڑتا اور بیٹھک کا کام دیتا۔ فیاض اکثر وہاں بیٹھ کر دفتر کا کام کیا کرتا۔ اس میں ایک پرانی دری بچھی تھی۔ ایک چھوٹی سی میز دو کرسیاں اور کتابوں کی ایک الماری تھی۔

حیدری خان نے سرود کو بہت احتیاط سے کمرے کے ایک کونے میں رکھ دیا۔ خود دری پر بیٹھ گیا اور گردن پھرا پھرا کر گھر کا جائزہ

لینے لگا۔

''کیا کرایہ دیتے ہو بابو جی اس کا؟'' اس نے پھر سلسلہ سوالات شروع کیا۔

''پندرہ روپے۔''

''اُفوہ! اتنے سے مکان کے پندرہ روپے۔ بہت کرایہ دیتے ہو تم تو بابو جی۔ بجلی بھی تو نہیں ہے اس میں۔''

اس کی چندھی آنکھیں پیتل کے اس پرانے لیمپ پر جمی ہوئی تھیں جو تپائی پر رکھا ہوا تھا اور جس کی چمنی کچھ کچھ دھواں دے رہی تھی۔

''ہاں استاد کرایہ تو کچھ زیادہ ہی ہے۔'' فیاض نے کہا۔ ''پر کیا کروں مدت سے یہیں رہتا ہوں۔ اس محلے میں جی لگ گیا ہے۔''

ایک لمحہ خاموشی رہی۔ پھر حیدری کہنے لگا۔ ''لے اب بابو جی جلدی سے کھانا لے آؤ۔ اللہ تمہاری خیر رکھے۔''

چند منٹ کے بعد اس کے سامنے دری پر ایک چھوٹا سا دستر خوان بچھا کر کھانا چن دیا گیا۔ کھانا تو معمولی سا مگر پکانے والی نے ایسے سلیقے سے پکایا تھا کہ حیدری خان کی زبان چٹخارے لینے لگی۔

''خوب پیٹ بھر کر کھاؤ استاد'' اور یہ کہہ کر فیاض نے اپنے حصے کا سالن بھی جو وہ اندر سے اٹھا لایا تھا اس کے سامنے رکھ دیا۔ حیدری خان کے سرود کا ابھی تک اس کے دل و دماغ پر ایسا اثر تھا کہ اسے کھانے کی ذرا اشتہا نہ تھی۔

''بس بس بابو جی'' حیدری خان نے کہا۔ ''فقیر کا تو بس دو نوالوں ہی میں پیٹ بھر جاتا ہے۔ لے اب بھی چائے اور پلوا دو۔ اللہ تمہاری خیر رکھے۔''

''چائے ابھی آتی ہے۔ میں نے کیتلی چولہے پر رکھوا دی ہے۔''

برتن ہٹا دیئے گئے اور فیاض حیدری خان کے پاس ہی دری پر بیٹھ گیا اور بڑی اشتیاق بھری نظروں سے اس کے سرود کو دیکھنے لگا۔ حیدری خان اس کے اشتیاق کو بھانپ گیا۔ وہ کونے سے اپنا ساز اٹھا لایا اور فیاض کی طرف بڑھا کر کہنے لگا۔

''لو شوق سے دیکھو بابو جی۔ ایسا ساز بھی تم نے کم ہی دیکھا ہوگا۔ یہ میرے استاد دلدار خان مرحوم (کان کی لو چھو کر) کی نشانی ہے۔ کئی سرودیوں نے سینکڑوں روپے کا لالچ دے کر مجھ سے سرود خریدنا چاہا مگر میں نے ان کے روپے پر لات ماردی۔ میری تو جان ہے اس میں بابو جی جیسے پریوں کی کہانی میں جن کی جان طوطے میں تھی۔ مجھے کوئی لاکھ روپیہ دے تب بھی میں اس سرود کو اپنے سے جدا نہ کروں۔''

فیاض نے سرود کو اپنی گود میں رکھ لیا۔ اچھا تو یہی وہ طلسمی ساز ہے جس سے ایسے ملکوتی سر نکلتے ہیں۔ وہ بڑے غور سے اسے دیکھنے لگا۔ اس کی عجیب سی بناوٹ' اس کی درجنوں کھونٹیاں' اس کا بڑا ڈھانچہ جس پر کھال منڈھی تھی۔ اس کی سینگ کی بنی ہوئی گھوڑی جس پر سارے تار کسے تھے۔ غرض ہر چیز اس کے لئے عجوبہ تھی۔

''اس کو بجاتے کس طرح ہو بھلا؟'' فیاض بے اختیار پوچھ بیٹھا۔

''لو میں تمہیں بتاتا ہوں بابو جی'' حیدری خان نے کہا۔ ''پہلے یوں آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاؤ جیسے میں بیٹھا ہوں۔ اور سرود کو یوں اپنے آگے رکھ لو۔ یہ لو جوا۔ اس کو دہنے ہاتھ کی انگلیوں میں یوں پکڑ لو اور اس طرح تار پر ضرب لگاؤ۔''

فیاض نے ایسا ہی کیا۔ ایک منحنی سی آواز نکلی۔

''پھر ضرب لگاؤ۔''

اب کے آواز کچھ بہتر تھی۔

''شاباش! بس یونہی ضربیں لگاتے رہو۔ لو اب بایاں ہاتھ سرود کے نیچے سے نکال لو۔ یوں۔ اب پہلی انگلی سے یوں اس تار کو دباؤ اور دہنے ہاتھ سے ضرب لگاؤ۔ دیکھا ایک نئی آواز پیدا ہوئی۔''

سبق یہاں تک پہنچا تھا کہ دوسرے کمرے سے کنڈی کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔

''خان صاحب ذرا سرود کو تھامنا میں چائے لے آؤں۔''

چائے پینے کے بعد موسیقی کی تعلیم پھر شروع ہوگئی۔ حیدری خان نے فیاض سے کھرج' رکھب' گندھار اور مدھم یہ چار سر سرود پر نکلوائے۔ اس وقت فیاض کی یہ کیفیت تھی کہ فرط شوق سے اس کا بند بند کانپ رہا تھا۔ اسے یقین ہی نہ آتا تھا کہ یہ سرے میرے ہاتھوں سے نکل رہے ہیں۔ اس سرود نوازی کی دھن میں اسے یہ بھی دھیان نہ رہا تھا کہ رات تیزی سے گزری جا رہی ہے۔ آخر دوسرے کمرے سے پھر کنڈی کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ فیاض ناچار اٹھ کر اندر گیا تو اصغری نے کہا۔ ''شاباش ہے تم کو بارہ بج گئے مگر تمہاری تن تن ختم نہ ہوئی۔ اب سونے بھی دو گے کسی کو۔ شریفوں کا محلہ ہے لوگ کیا کہیں گے آخر۔''

''تم سچ کہتی ہو بس اب میں ختم کیا چاہتا ہوں۔''

وہ بیٹھک میں آیا تو حیدری خان کو گدڑی اوڑھے فرش پر دراز پایا۔ سرود کو اس نے پھر کونے میں رکھ دیا تھا۔ اس سے فیاض کو کسی قدر مایوسی ہوئی۔

''بابو جی'' حیدری خان نے گدڑی کے اندر سے کہا۔''رات بہت بیت لی۔ میں نے سوچا اب کہاں جاؤں گا یہیں پڑ رہتا ہوں۔ صبح ہوتے ہی چل دوں گا۔ تمہاری خیر ہو ذرا لیمپ کی بتی نیچی کر دینا پر بجھانا نہیں۔''

''بہت اچھا'' فیاض نے کہا اور وہ لیمپ کی بتی نیچی کر کے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

اگلے روز صبح دم ابھی سورج نکلنے نہ پایا تھا کہ فیاض بستر سے اٹھ کر بیٹھک میں آ گیا۔ اس وقت سردی خاصی بڑھ گئی تھی۔ حیدری خان اپنی گدڑی میں گٹھڑی بنا بے خبر سو رہا تھا۔ مگر فیاض کو جیسے سردی کی کمی بیشی کا کچھ احساس ہی نہ تھا۔ وہ سرود اٹھا فرش پر اکڑوں بیٹھ گیا اور ہلکے ہلکے انہی چاروں سروں کو بجانے لگا جو حیدری خان نے رات اسے سکھائے تھے۔ سرود کی آواز سن کر گٹھڑی میں حرکت ہوئی۔ حیدری خان نے گدڑی میں سے سر نکالا۔ فیاض کی صورت دیکھی۔ ایک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے سوکھے ہوئے ہونٹوں پر نمودار ہوئی اور اس نے سر پھر گدڑی کے اندر کر لیا۔

فیاض بڑے انہماک کے ساتھ سرود پر مشق کرتا رہا۔ اس کام میں اسے ایسی طمانیت حاصل ہو رہی تھی کہ زندگی میں پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔ جب اسے سرود بجاتے کافی دیر ہو گئی تو اس کی دونوں بیٹیاں نجمہ اور سلیمہ بھی اس کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔ دونوں نے سر اور کانوں کو اونی رنگ دار گلو بندوں سے ڈھک رکھا تھا۔ نجمہ کی عمر گیارہ برس تھی اور سلیمہ کی نو برس۔ دونوں بڑی پیاری پیاری بچیاں تھیں۔ وہ ایک معصومانہ ادا کے ساتھ جس میں حیرت کے ساتھ ساتھ تمسخر کا عنصر بھی شامل تھا۔ باپ کو یہ بڑا سا عجیب و غریب ساز بجاتے دیکھنے لگیں۔ ہنسی ان کے ہونٹوں پر آ آ کر رک جاتی۔

''میں نے کہا آج دفتر نہیں جاؤ گے؟'' اصغری نے چلمن کے پیچھے سے کہا۔

''اتوار ہے بھئی اتوار ہے۔''

یہ کہہ کر فیاض پھر سرود بجانے میں مشغول ہو گیا۔ اصغری نے حیدری خان کو گدڑی میں منہ چھپائے بے خبر سوتے دیکھا تو دوپٹہ سنبھالتی ہوئی بیٹھک میں چلی آئی اور فیاض کے کان کے قریب منہ لا کر کہنے لگی۔''یہ کب دفان ہو گا؟''

''خدا کے لئے چپ رہو کہیں سن نہ لے۔ بڑا صاحب کمال آدمی ہے۔''

''ہوا کرے میں پوچھتی ہوں یہ جائے گا کب؟''

''بس ناشتہ کر کے بھیج دیں گے۔ تم یہاں سے چلی جاؤ۔ کہیں اٹھ نہ بیٹھے۔''

کوئی دس بجے کے قریب حیدری خان جمائیاں لیتا اپنی کالی کالی انگلیوں کو جن کے ناخن بے تحاشا بڑھے ہوئے تھے اور ان میں

میل بھرا تھا' چنچناتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ فیاض ابھی تک سرود بجانے میں منہمک تھا۔ اس میں تین چار گھنٹے کے ریاض سے اسے ان چاروں سروں کی خوب مشق ہو گئی تھی۔ سر روانی اور زور کے ساتھ نکلنے لگے تھے۔ حیدری خان کو فیاض کے اس انہماک پر اچنبھا سا ہوا۔

''لو بابو جی اب تم گنڈا بندھوانے کی فکر کرو۔ تم نے تو کمال ہی کر دیا۔ تم تو سچ مچ بجانے لگے۔ مجھے اب تک جو شاگرد ملا کم بخت کوڑھ ہی ملا۔ تم جیسا ذہین شاگرد ہو تو تین ہی مہینے میں استاد نہ بنادوں تو میری موچھیں منڈوا دینا۔ پر یہ سن رکھو میاں میری ٹیوشن کی فیس سو روپیہ مہینہ ہے سو روپیہ مہینہ۔'' یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگا۔ ''ایک بات ہے بابو جی ماشاء اللہ سے تمہارے ڈیل ڈول پر یہ ساز پھبتا بھی خوب ہے۔ شیر کے بچے معلوم ہوتے ہو' شیر کے بچے''

ناشتہ ہو لیا مگر حیدری خان کے رخصت ہونے کے آثار دکھائی نہ دیئے اس پر دوسرے کمرے میں اصغری نے پھر کنڈی کھٹکھٹائی۔ فیاض اٹھ کر اندر گیا۔

''میں نے کہا آج سودا سلف نہیں آنے کا؟ تم کو تو گانے بجانے میں کھانے پینے کی بھی سدھ نہ رہی مگر بچوں کو تو بھوکا نہ مارو۔''

''او ہو' میں تو بھول ہی گیا تھا۔ لو ابھی بازار جاتا ہوں۔''

جس وقت فیاض کپڑے بدل کر بیٹھک میں آیا تو حیدری خان بھی سر پر اپنی بے پھندنے کی میلی ٹوپی رکھ' سرود بغل میں دبا' گدڑی سنبھال چلنے کو تیار کھڑا تھا۔ فیاض کا منہ اتر سا گیا۔

''کیوں استاد کہاں چل دیئے۔''

''ذرا جا کر نشہ پانی کر لوں۔'' حیدری خان نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔ ''ایک روپیہ ہو تو دلواؤ۔''

فیاض فوراً اندر جا کر روپیہ لے آیا۔

''خیر ہو بابو جی کی'' اس نے روپیہ واسکٹ کی جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔ ''شاید شام کو پھر آتا ہوں''

اس نے ایک اور جمائی لی۔ واقعی اس کا نشہ ٹوٹ رہا تھا۔ وہ دروازے کی طرف چلا۔ جب تک وہ سیڑھیوں سے اتر نہ گیا۔ فیاض برابر دروازے میں کھڑا اسے جھانکتا رہا۔ اس کے جانے کے بعد فیاض کو اچانک ایک بے چینی سے محسوس ہونے لگی۔ کاش حیدری خان اپنا سرود یہیں چھوڑ جاتا اور وہ آج چھٹی کے دن خوب خوب مشقیں کرتا رہتا۔ وہ کھویا کھویا سا چارپائی پر لیٹ گیا۔ رات سے اس پر ایک مسلسل اضطراب کی کیفیت طاری تھی۔ اسے نیند بھی اچھی طرح نہ آئی تھی۔ اصغری نے اس کی اداسی کو بھانپ کر کہا۔

''یہ ایکا ایکی کیسا شوق لگ گیا ہے تمہیں ڈوم ڈھاری بنو گے؟ اور یہ موافقیر۔۔۔''

فیاض نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''جس کو تم موافقیر کہتی ہو ملک میں جواب نہیں اس کا۔''

''بلا سے نہ ہو بھاڑ میں جائے۔ مجھے تو یہ ڈر ہے کہ نامراد نے گھر دیکھ لیا ہے اب تو روز ہی آ دھمکا کرے گا۔''

''کاش ایسا ہی ہو۔''

''تو کیا ساز سیکھو گے تم؟''

''کاش میں اسے سو روپیہ ٹیوشن کی فیس دے سکتا۔''

اصغری کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

سودسلف آیا' کھانا پکا۔ میاں بیوی اور لڑکیاں کھانے بیٹھیں۔ مگر فیاض نے دو چار نوالوں کے بعد ہی ہاتھ کھینچ لیا۔ اصغری نے یہ حال دیکھا تو اس کو سچ مچ تشویش ہونے لگی۔ پچھلے چند گھنٹوں میں وہ اسے بدلا ہوا پا رہی تھی۔ وہ نہ تو اس کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھتا۔ نہ اس کی بات غور سے سنتا اور نہ ڈھنگ کا جواب دیتا۔ لڑکیوں کی طرف بھی اس کی کچھ توجہ معلوم نہ ہوتی تھی۔

دن ڈھل گیا۔ شام ہو گئی۔ چراغ جل گئے مگر حیدری خان نہ آیا۔ فیاض بار بار سیڑھیوں میں جھانکتا۔ پھر آ کر بستر پر لیٹ جاتا۔ پھر اٹھ بیٹھتا۔ اس کی بے چینی بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ آخر آٹھ بجے کے قریب سیڑھیوں میں کسی کے کھنکارنے کی آواز سنائی دی۔ یہ حیدری خان ہی تھا۔ وہ جھوم رہا تھا۔ اس کی آنکھیں پچھلی رات سے زیادہ سرخ ہو رہی تھیں۔ اس کے حواس بجا نہ تھے۔ معلوم ہوتا تھا آج اس نے کچھ زیادہ ہی نشہ پانی رکھا ہے۔ سرود کو دیکھ کر فیاض کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

''لو میاں آ گئے ہم۔ تم بھی کیا یاد کرو گے۔'' یہ کہہ کر وہ آلتی پالتی مار فرش پر بیٹھ گیا۔

''فیاض میاں' ذرا بہو سے کہہ کر چائے بنوا لو۔ بس چائے ہی۔ میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔''

پھر نہ جانے کیا ترنگ اٹھی کہ وہ سرود بجانے لگا۔ ابتدا تو بڑے جوش و خروش سے کی مگر دو ہی منٹ بعد انگلیاں سست پڑنے لگیں اور جب اندر سے چائے بن کر آئی تو وہ سرود پر جھکا خراٹے لے رہا تھا۔

فیاض نے اس کا شانہ پکڑ کر ہلایا مگر اس پر ایسی بے ہوشی کی نیند طاری تھی کہ مطلق آنکھ نہ کھولی۔ فیاض نے سرود کو اس کی گرفت سے الگ کر کے اسے آہستگی سے فرش پر لٹا دیا اور گدڑی اوڑھا دی۔ پھر بڑے اشتیاق کے ساتھ سرود کو اٹھا کر بجانا شروع کر دیا۔

اگلے روز حیدری خان کی آنکھ صبح سویرے ہی کھل گئی۔ دیکھا کہ فیاض اس کے قریب ہی بیٹھا اس کے بتائے ہوئے چاروں

سروں کی مشق کررہا ہے۔وہ سراہے بغیر نہ رہ سکا۔

''فیاض میاں ماشاء اللہ کیا سچے سرنکال رہے ہو۔ واہ واہ جی خوش ہو گیا۔ آج میں تمہیں اگلے تین سر بھی بتادوں گا۔ پھر سپتک مکمل ہو جائے گی۔''

اور سچ مچ تھوڑی ہی دیر میں حیدری خان نے پنجم دھیوت اور نکھاد کے سر بھی فیاض کے ہاتھ سے نکلوادیے۔خوشی سے فیاض کی آنکھوں میں آنسو آ گئے مگر جلد ہی بادل نخواستہ اسے موسیقی کی یہ تعلیم ختم کرنی پڑی کیونکہ آٹھ بجنے والے تھے اور اسے دفتر جانے کے لئے تیار ہونا تھا۔

حیدری خان نے ناشتے کے بعد اپنا سرود اٹھایا۔اس دفعہ اسے روپیہ مانگنے کی ضرورت نہ پڑی۔کیونکہ فیاض نے خود ہی اندر سے روپیہ لا کر اسے دے دیا تھا۔

''خوش رہو میاں'' حیدری خان بولا۔پھر چند لمحے تامل کر کے اس نے بڑے گمبھیر لہجہ میں کہنا شروع کیا۔''سنو میاں' اگر تمہیں مجھ سے سیکھنا ہے تو تمہیں میری تین شرطیں منظور کرنی ہوں گی۔ یوں تو یہ شرطیں بہت آسان معلوم ہوں گی۔ پر غور کرو تو دشوار بھی بہت ہیں۔ کیونکہ میں سڑی مشہور ہوں' ذرا بھی کوئی کام میری مرضی کے خلاف ہو تو مجھے بڑا قلق ہوتا ہے۔اپنی اس بدمزاجی ہی کی خاطر میں نے فقیری قبول کی ہے۔لو اب وہ شرطیں بھی سن لو۔اول یہ کہ صبح کو تمہیں میرے ناشتے اور نشے پانی کا انتظام کرنا ہو گا۔دوپہر کو میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔صبح ادھر دفتر کو چلے اور ادھر میں کھسکا۔شام کو جب تم دفتر سے آ چکو گے تو میں بھی اپنے پھر پھرا کے پہنچ جایا کروں گا۔ دوسری شرط یہ ہے کہ رات کا کھانا ہم دونوں ساتھ ساتھ کھائیں گے اور تیسری شرط یہ ہے کہ سویا میں بیٹھک میں کروں گا' وہ جو سو روپیہ ٹیوشن کی بات کی تھی وہ تو میں تم سے مذاق کرتا تھا میاں۔ مجھے روپے کا لالچ ہوتا تو حویلیاں نہ کھڑی کر لی ہوتیں اب تک۔ بس یہی ہیں تین شرطیں اگر تمہیں منظور ہوں تو بسم اللہ''

فیاض کچھ دیر گردن جھکائے ہوئے سوچ میں ڈوبا رہا۔جب اس نے سر اٹھایا تو سب سے پہلے اس کی نظر چلمن پر پڑی۔حیدری خان کی طرح اصغری بھی اس کے جواب کی منتظر تھی۔

''خان صاحب'' اس نے دھیمی آواز مگر فیصلہ کن لہجے میں کہا۔''مجھے آپ کی تینوں شرطیں منظور ہیں۔آج سے آپ میرے استاد ہیں۔''

اسی شام حیدری خان اپنا بوریا بدھنا لے کر فیاض کے ہاں اٹھ آیا۔ یہ بوریا بدھنا کیا تھا' ٹین کا ایک ٹرنک جس کا روغن اڑا ہوا اور

کنڈا غائب تھا۔ حیدری خان نے اسے بند کرنے کے لئے رسی باندھ رکھی تھی۔ ایک مٹی کا سڑا سا حقہ تھا اور ایک پیالہ۔

اصغری کے دل کو چوٹ تو لگی اور اس نے کچھ آنسو بھی بہائے مگر وہ طبعاً ان اطاعت گزار بیویوں میں سے تھی جو شوہروں کو مجازی خدا سمجھتی ہیں اور ہر حال میں ان کی خوشنودی کی جویا رہتی ہیں۔ موسیقی سے میاں کے اس جنون کی حد تک بڑھے ہوئے شوق کو دیکھ کر اس نے زیادہ مزاحمت نہ کی اور حیدری خان کا اپنے ہاں رہنا منظور کر لیا۔ دو چار ہی دن میں اسے حیدری خان کی سرشت کا اندازہ بھی ہو گیا۔ وہ نشہ باز تو تھا مگر بدنظر ہرگز نہ تھا۔ پرائی بہو بیٹیوں کو تاکنے جھانکنے کی اسے عادت نہ تھی۔ وہ اصغری کو ہمیشہ بہو یا بیٹی کہہ کر پکارتا اور جب تک فیاض باہر رہتا گھر کے نزدیک نہ پھٹکتا۔

سب سے پہلے فیاض کو حیدری خان کی ظاہری حالت سدھارنے کی فکر ہوئی۔ حیدری خان بہتیرا منع کرتا رہا مگر اس نے ایک نہ سنی۔ اس نے خان صاحب کے لئے ایک نیا جوڑا سلوایا۔ اس کے پاس بڑھیا سیاہ کپڑے کی ایک شیروانی تھی جسے وہ کبھی کبھی پہن لیا کرتا تھا۔ یہ شیروانی دو ایک جگہ سے مسک تو گئی تھی مگر ابھی اچھی حالت میں تھی۔ وہ اسے ایک درزی کے پاس لے گیا اور اس میں قطع و برید کرا کے اسے خاں صاحب کے ناپ کا بنوا لیا۔ پھر اس نے خان صاحب کی ترکی ٹوپی کو دھلوا کے اس میں نیا پھندنا لگوایا۔ اس نے خان صاحب کے لئے ایک مضبوط سا جوتا بھی خریدا۔ پھر ان سب چیزوں کو ایک سوٹ کیس میں رکھ خان صاحب کو ساتھ لے کر ایک حمام میں پہنچا۔ وہاں پہلے تو خان صاحب کے پٹوں کو مختصر کرایا' داڑھی منڈوائی' مونچھوں کو ترشوایا' ناخن کٹوائے۔ پھر حمام والے سے دو مرتبہ حمام میں پانی بھروا کر اسے خوب نہلوایا۔ اس کے کپڑے بدلوائے۔ جس وقت حیدری خان حمام سے نکلا تو ایک اچھا خاصا معقول انسان نظر آنے لگا۔

اس وقت دوپہر ہو چکی تھی' ظہر کا وقت تھا۔ دونوں گھر واپس آ رہے تھے کہ راستے میں ایک مسجد نظر آئی۔ حیدری خان وہیں ٹھہر گیا۔ اس نے بڑی رقت بھری آواز میں فیاض سے کہا۔

''فیاض بیٹے' آج بڑی مدت کے بعد پاک صاف ہوا ہوں اور کپڑے بھی پاک ہیں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ آج اپنے مولا کے سامنے ذرا سر جھکا لوں۔''

فیاض کو کچھ تعجب تو ہوا مگر اس نے خان صاحب کی خواہش کو رد نہ کیا اور دونوں دوسرے نمازیوں کے ساتھ مسجد میں داخل ہو گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد جب حیدری خان مسجد سے نکلا تو اس کی آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہو گئی تھی۔ لباس کی اس تبدیلی کے ساتھ ہی اس کے طور بھی ایک دم بدل گئے۔ اس کی زبان سے وہ بات بات پر دعائیہ کلمات کا نکلنا بند ہو گیا۔ اس کے بجائے اس کے انداز

تخاطب میں ایک تحکم پایا جانے لگا۔ جس وقت فیاض اس کے ہمراہ بازار سے گزر رہا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی مودب شاگرد استاد کے ساتھ ساتھ جا رہا ہو۔

اصغری نے حیدری خان کی یہ دھج دیکھی تو حیران رہ گئی۔ اسے پہلے پہل اس شخص سے جو کراہت محسوس ہوئی تھی وہ جاتی رہی تھی۔ حیدری خان نجمہ اور سلیمہ سے بڑی شفقت سے پیش آنے لگا تھا۔ فیاض اسے ہر روز نشہ پانی کے لئے جو روپیہ دیا کرتا تھا وہ اس میں سے دو تین آنے بچا ان بچیوں کے لئے کچھ مٹھائی یا پھل ضرور خرید لاتا۔ بچیاں چند ہی روز میں اس سے خوب مانوس ہو گئیں۔ وہ اسے ''خان صاحب جی'' کہہ کر بلاتیں۔

حیدری خان اصغری کے کھانا پکانے کی بھی سچے دل سے تعریف کیا کرتا۔ وہ کہتا ''بیٹی سبحان اللہ' کیا لذیذ کھانا پکاتی ہو' جو راجوں اور نوابوں کو بھی نصیب نہیں۔ ان کے کھانوں میں تو بس تکلف ہی تکلف ہوتا ہے' مزہ خاک بھی نہیں۔

رفتہ رفتہ اس کی تعریفوں میں اصغری کو مزہ آنے لگا۔ وہ کبھی کوئی خاص چیز پکاتی تو دل میں کہتی ''دیکھیں آج خان صاحب کیا کہتے ہیں۔'' اب خان صاحب کے گھر میں آنے جانے کی کوئی پابندی نہ رہی تھی کیونکہ اصغری نے میاں کا عندیہ پا کر ان سے پردہ کرنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ حیدری خان سے کہتی ''خان صاحب آپ دوپہر کا کھانا بھی گھر ہی آ کر کھا لیا کریں۔'' مگر حیدری خان کو یہ وقت تکیوں میں گزارنا زیادہ پسند تھا۔

ادھر فیاض خان کے ذوق وشوق کو دیکھ کر حیدری خان نے اسے پوری توجہ سے سرود کی تعلیم دینی شروع کر دی تھی۔ اس نے مہینے ڈیڑھ مہینے کے اندر ہی فیاض کو دو تین راگوں کی الاپ اور کچھ گتیں بھی سکھا دی تھیں اور اب فیاض سرود نوازی میں روز بروز ترقی کرنے لگا تھا۔ اگرچہ اس پر حیدری خان کے اخراجات کا پورا بوجھ پڑ گیا تھا جس سے وہ بہت تنگدست ہو گیا تھا۔ پھر بھی وہ خوش تھا۔ ایسا خوش کہ زندگی سے پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔

چونکہ حیدری نے بازاروں میں بیٹھ کر سرود بجانا اور مانگنا ترک کر دیا تھا۔ اس لئے اس کا سرود زیادہ تر گھر ہی میں رہتا۔ اس نے فیاض کو پوری اجازت دے رکھی تھی کہ وہ جب تک چاہے اس کے سرود پر ریاض کرتا رہے۔ فیاض صبح کو دفتر جانے سے پہلے دو گھنٹے خوب ریاض کرتا۔ دفتر میں بھی سارا دن اس کی انگلیاں فائلوں پر یوں دوڑتی رہتیں جیسے وہ سرود بجانے کی مشق کر رہا ہو۔ اب وہ ٹھیک پانچ بجے دفتر سے چھٹی کر لیتا اور شہر کے پر شور بازاروں اور تنگ گلیوں سے ہوتا ہوا جلد سے جلد گھر پہنچ جاتا۔ چھٹی کے روز سرود کو ہاتھ سے چھوڑنے کی اسے قسم ہو جاتی۔

تھوڑے ہی دنوں میں حیدری خان کے دل میں فیاض کی انسیت بے حد بڑھ گئی۔ وہ اس سے اس طرح پیش آتا جیسے باپ اپنے بیٹے سے۔ وہ اب تکیوں میں زیادہ دیر نہ ٹھہرتا۔ بلکہ فیاض کے دفتر سے آنے سے گھنٹہ دو گھنٹے قبل ہی وہ گلی میں اس کے مکان کے نیچے چارپائی ڈال کر بیٹھ جاتا۔ اکثر اوقات وہ اکیلا ہی ہوتا مگر کبھی کبھی اس کے دو تین دوست بھی اس کے ساتھ آجاتے۔ اس پر گلی میں گانے بجانے کے لمبے لمبے تذکرے چل نکلتے۔

''میاں جانتے بھی ہو لفظ موسیقی کے معنی کیا ہیں؟'' حیدری خان اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر کہتا۔ ''اللہ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے استاد دلدار خان (کان کی لو چھو کر) کہا کرتے تھے کہ یہ یونانی لفظ ہے۔ اس کے معنی ہیں ہوا میں گرہ لگانا۔ اب تم خود ہی اندازہ کر لو کہ یہ فن کس قدر مشکل ہے۔''

پھر وہ مکان کی سیڑھیوں میں منہ کر کے پکارتا۔ ''نجمہ بیٹی دو تین پان بھیج دینا۔''

کبھی کبھی فیاض کو بھی استاد کی خوشنودی کے لئے گلی ہی میں بیٹھ جانا پڑتا۔ ایسے موقع پر حیدری خان اپنے دوستوں سے فخریہ کہتا۔ ''میاں یہ عطائی اب تم سب کے گنڈا باندھے گا۔ ہے تو مولوی کا بیٹا۔ مگر خدا کی دین ہے۔ ہاتھ ایسا سریلا ہے کہ سردئیوں کے گھرانوں کے لونڈوں کا بھی کیا ہوگا۔''

اور فیاض کے ماتھے پر شرم سے پسینہ آجاتا اور وہ نیچی نظریں کئے یہ باتیں سنتا رہتا۔ ایسے میں جو لوگ گلی میں آجا رہے ہوتے۔ ان کی نظریں بے اختیار اس منڈلی پر اٹھ جاتیں اور وہ تھوڑی دیر تک ادھر مڑ مڑ کر دیکھتے ہوئے چلے جاتے۔

یہ محلہ خاص شرفا کا تھا۔ زیادہ تر متوسط طبقے کے لوگ ہی یہاں رہتے تھے مگر کچھ گھر کھاتے پیتے لوگوں کے بھی تھے۔ کچھ مولویوں اور ثقہ قسم کے لوگوں کے تھے۔ ایک چھوڑ تین تین مسجدیں اس چھوٹے سے محلے میں تھیں۔ علی الصبح مرغوں کی ککڑوں کوں کے ساتھ ہی آگے پیچھے مسجدوں سے اذانیں سنائی دینے لگتیں اور سارے محلے پر ایک تقدس کی فضا چھا جاتی۔

فیاض کو اس محلے میں رہتے دس برس ہو چکے تھے۔ اس عرصے میں کبھی کسی کو اس وجہ سے شکایت پیدا نہ ہوئی تھی۔ سب لوگ اسے خاموش، کم آمیز اور شریف سمجھ کر پسند کرتے تھے مگر اب حیدری خان کے آجانے کی وجہ سے گھر پر دن رات گانے بجانے کا جو ہنگامہ رہنے لگا تو اس پر محلے والے ٹھٹکے۔ انہیں تعجب تھا کہ فیاض نے اپنے گھر پر ایسے عجیب و غریب قماش کے لوگوں کے تسلط کو کیسے گوارا کر لیا۔ پھر فیاض کو یہ بھی تو احساس نہیں کہ ان لوگوں کی بیہودہ حرکات کا اس کی زوجہ اور معصوم بچیوں کے اخلاق پر کتنا گھناؤنا اثر پڑتا ہوگا۔ جگہ جگہ چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ ناراضگی کی لہر بڑھتی ہی چلی گئی۔ یہاں تک کہ ایک شام جب فیاض دفتر سے گھر آرہا تھا تو

گلی کے موڑ پر اس کی مڈبھیڑ محلے کی بڑی مسجد کے امام صاحب سے ہوئی۔

''السلام علیکم'' امام صاحب نے مصافحہ کرنے کے بعد سینے پر ہاتھ رکھا اور یوں گویا ہوئے۔''برادر! میں کئی دن سے آپ سے ملنا چاہتا تھا۔ وہ بات یہ ہے کہ آپ کو موسیقی سے ازحد لگاؤ پیدا ہو گیا ہے۔ ہر چند اسلام میں خوش آوازی اور لحن کو بڑا درجہ حاصل ہے مگر استغفراللہ' یہ خرافات جو دن رات آپ کے گھر پر ہوتی رہتی ہیں ان کو تو کسی صورت میں بھی اجازت نہیں ہے۔ بلاشک آپ اپنے فعل کے خود مختار ہیں اور رب العزت کے سامنے آپ اپنے اعمال کے خود جوابدہ ہوں گے مگر یہ مسئلہ صرف آپ ہی کی ذات تک محدود نہیں ہے بلکہ پورے محلے پر آپ کی ان خرافات کا نہایت قبیح اثر پڑ رہا ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ جناب ٹھنڈے دل سے میری اس گزارش پر غور فرمائیں گے اور ان لغویات سے جلد چھٹکارا حاصل کر لیں گے۔ بس مجھے یہی کہنا تھا۔''

جس وقت فیاض گھر پہنچا تو وہ بڑا رنجیدہ اور دل شکستہ ہوا۔ اتفاق سے حیدری خان ابھی گھر نہیں آیا تھا۔ فیاض سیدھا اپنے کمرے میں جا کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ گو اس کا دل ریاض کرنے کے لئے بے چین تھا مگر اسے سرود کو ہاتھ لگانے کی جرات نہ ہوئی۔ وہ دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ اصغری نے اس کی یہ کیفیت دیکھی تو پوچھا۔''نصیب دشمناں کچھ طبیعت خراب ہے' آپ کی؟''

''نہیں تو'' فیاض نے کہا' مگر وہ بستر سے نہ اٹھا۔

آخر جب شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تو حیدری خان آیا۔ فیاض سیڑھیوں ہی سے اس کے قدموں کی چاپ سن کر جلدی سے سرود اٹھا کر بجانے بیٹھ گیا۔ وہ اب استاد سے ڈرنے لگا تھا اور اس پر ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتا تھا کہ اس نے یہ دو گھنٹے یونہی ضائع کر دیئے۔

''فیاض بیٹے'' حیدری خان نے بیٹھک میں قدم رکھتے ہی کہا۔''تھک گئے ہو ذرا دم لے لو۔ بھئی آج میں نے اپنے ایک واقف کار کے ذریعے تمہارے لئے بمبئی سے اچھا سا سرود منگوانے کا بندوبست کر ہی لیا۔ اب اللہ نے چاہا تو جلد ہی طبلچی کا انتظام بھی ہو جائے گا۔''

فیاض نے تشکر آمیز نظروں سے استاد کی طرف دیکھا مگر زبان سے کچھ نہ کہا۔ اس کے بعد حیدری خان ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔ اتنے ہی میں کھانے کا وقت ہو گیا اور یوں فیاض اس شام سرود سے کنارہ کش ہی رہا مگر اس کے دل میں اہل محلہ اور امام مسجد کے خلاف سخت غصہ بھرا ہوا تھا۔

اگلے روز فیاض وقت سے کچھ پہلے ہی دفتر چلا گیا۔ دوپہر کو حیدری خان ایک شخص کو ساتھ لئے ہوئے آیا۔ جس کی وضع قطع پنڈتوں کی سی تھی۔ پردہ کرا دیا گیا اور وہ دونوں فرش پر بیٹھ گئے۔ ٹھیک اسی وقت نجمہ اور سلیمہ استانی سے پڑھ کر گھر آئیں۔ انہوں نے

حیدری خان کو سلام کیا۔

''جیتی رہو میری بچیو'' حیدری خان نے پر شفقت لہجہ میں کہا۔ ''ہاں بھی' ذرا بستے رکھ کر ادھر آ جاؤ۔ آج تمہارا امتحان لیں گے ہم۔''

دونوں لڑکیاں بستے ماں کے حوالے کر کے خان صاحب کے سامنے ادب سے آ کر بیٹھ گئیں۔ خان صاحب نے سرودا ٹھایا اور اس کا ایک سر بجا کر نجمہ سے کہا۔ ''لے بیٹی ذرا اس آواز کے ساتھ اپنی آواز تو ملا۔ شاباش!''

نجمہ کچھ شرمائی۔ مگر خان صاحب کے اصرار پر آواز ملانے کی کوشش کرنے لگی۔ ''بیٹی اونچی آواز سے کہو آ آ... یوں''

لڑکی ذہین تھی تھوڑی سی مشق کے بعد اس نے ساز کے سر کے ساتھ اپنی آواز ملا دی۔ اس پر حیدری خان نے اپنے ساتھی پنڈت کی طرف پر معنی خیز نظروں سے دیکھا اور کہا۔ ''کیوں کالکا پرشاد جی؟''

کالکا پرشاد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے دو مرتبہ ''ہوں ہوں'' کہا' اس کے بعد حیدری خان نے نجمہ اور سلیمہ سے کہا۔ ''بس جاؤ' شاباش شاباش۔ منہ ہاتھ دھو کر کھانا کھاؤ۔''

جب لڑکیاں چلی گئیں تو وہ کالکا پرشاد سے کہنے لگا۔ ''شام کو ان کا باپ آئے گا تو اس سے بات کروں گا۔'' پھر وہ تھوڑی دیر کے بعد اپنے دوست کو لے کر چلا گیا۔

اس شام جب فیاض دفتر سے آیا تو اصغری بھری بیٹھی تھی۔ اسے دیکھتے ہی برس پڑی۔ ''دیکھو جی' اب تک تو ہم تمہاری سب باتیں مانتے چلے گئے تھے مگر اب معاملہ حد سے بڑھ گیا ہے میں اپنی لڑکیوں کو ہرگز ہرگز گانا نہ سیکھنے دوں گی۔''

''کچھ بتاؤ تو سہی' ہوا کیا؟ تم تو معموں میں باتیں کر رہی ہو۔''

''آج دوپہر کو خان صاحب آئے تھے۔ ان کے ساتھ کوئی پنڈت جی بھی تھے۔ نجمہ اور سلیمہ بھی اسی وقت سکول سے آئی تھیں۔ پہلے خان صاحب نے دونوں لڑکیوں کو گوایا۔ پھر نہ جانے چپکے چپکے آپس میں کیا باتیں کرتے رہے۔ میں چلمن میں سے سب دیکھتی رہی۔ سنو جی اگر خان صاحب چاہیں کہ میری معصوم بچیاں رنڈیوں کی طرح ناچنے گانے لگیں تو یہ ہونے کا نہیں۔ چاہے مجھے ان کو لے کر میکے ہی کیوں نہ بیٹھ رہنا پڑے۔''

فیاض کچھ کہنے ہی کو تھا کہ اتنے میں حیدری خان بھی آ گیا۔

''فیاض بیٹے'' اس نے بیٹھک میں قدم رکھتے ہی کہنا شروع کر دیا۔ ''اللہ تمہاری عمر میں برکت دے۔ میں تم سے ایک ضروری

بات کرنا چاہتا ہوں اور اصغری بیٹی اللہ تیرا سہاگ قائم رکھے' تو بھی کان دھر کے سن۔ تم دونوں نے کبھی یہ بھی سوچا کہ دونوں بیٹیاں ماشاءاللہ دو تین برس میں جوان ہونے کو ہیں۔ تم نے کچھ ان کی شادی بیاہ کی بھی فکر کی۔ مجھے تو نظر آتا نہیں کہ تم نے ان کے لئے کچھ جہیز جمع کیا ہو اور پھر تم کر بھی کیا سکتے۔ ڈیڑھ سو روپلی کی بھلا حقیقت ہی کیا ہے۔ آخر تم ان معصوم بچیوں کو کس طرح ٹیک لگاؤ گے۔ کسی کنجڑے قصائی کو تو خدانخواستہ تم بیٹی دینے سے رہے۔ رہے دفتروں کے بابو جن کو تیس چالیس روپلی سے زیادہ تنخواہ نہیں ملتی۔ ان کو لڑکی دینا ایسا ہی ہے جیسا بھاڑ میں جھونک دینا۔ بچیاں ماشاءاللہ سے ایسی خوبصورت ہیں جیسے چاند کا ٹکڑا۔ ان کو تو کسی قدردان رئیس کے ہاں رانی بن کر راج کرنا چاہیے مگر میاں صاحبزادے امیر لوگ شادی بیاہ کے معاملے میں بڑی مین میخ نکالتے ہیں۔ لڑکی خوبصورت ہو' پڑھی لکھی ہو' بہت سا جہیز لائے اور پھر اسے کوئی ہنر بھی آتا ہو جیسے گانا یا مصوری۔ مگر ان بچیوں میں سوائے صورت شکل کے اور رکھا ہی کیا ہے۔

مجھے کئی دنوں سے اس بات کی بڑی فکر تھی۔ تم دونوں میاں بیوی تو سو جاتے تھے مگر میں رات رات بھر اس فکر میں غلطاں پیچاں رہتا تھا۔ آخر سوچ سوچ کر میں نے یہ ترکیب نکالی ہے کہ ان لڑکیوں کو تھوڑا سا ناچ گانا سکھا دیا جائے۔ تم جانو آج کل امیر امراء میں ناچ گانے کا شوق کس قدر ترقی پر ہے۔ پہلے ہندوؤں نے یہ بات شروع کی تھی' ان کی دیکھا دیکھی اب مسلمان بھی اپنی بیٹیوں کو گانا بجانا سکھلانے لگے ہیں۔

میں دوپہر کو پنڈت کالکا پرشاد کو لایا تھا۔ وہ شہر کے نامی کتھک ہیں۔ نواب شمشیر علی خان کی لڑکیاں' رائے بہادر ستنام کی لڑکیاں' چودھری نیک عالم کی لڑکیاں آج کل ان ہی سے سیکھ رہی ہیں۔ ان تین گھرانوں کو تو میں جانتا ہوں۔ اللہ جانے اور کتنے گھرانوں میں جاتے ہوں گے۔

تو میاں صاحبزادے خدا شاہد ہے تم مجھے بیٹوں سے بھی زیادہ عزیز ہو اور اصغری بیٹی تو بھی میری سگیوں سے کم نہیں۔ میں نے جو بات سوچی ہے تمہارے ہی بھلے کے لئے سوچی ہے۔ میرے نہ آل ہے نہ اولاد۔ جو کچھ ہو تمہی ہو۔ پھر میں تمہارا برا کیوں چاہوں گا۔"

اس تقریر کے آخری حصے کے دوران حیدری خان کی آواز شدت جذبات سے بھرا گئی تھی اور ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے تھے۔ آخر وہ کرتے کے دامن سے آنسو پونچھتا ہوا اٹھا اور یہ کہتا ہوا سیڑھیوں کی طرف چلا۔ "تم دونوں خوب سوچ سمجھ لو۔ اگر منظور ہو تو کل ہی سے بچیوں کی تعلیم شروع کرا دی جائے۔ لو اب میں چلتا ہوں۔ میرے کچھ دوست نیچے کھڑے ہیں۔ مجھے ان سے کام ہے۔ میں

ذرا دیر میں آؤں گا۔"

اس کے جانے کے بعد فیاض اور اصغری دیر تک خاموش بیٹھے ایک دوسرے کا منہ تکا کئے۔ آخر فیاض نے سکوت توڑا۔ ''کہو کیا کہتی ہو؟''

''میری سمجھ میں تو کچھ آتا نہیں۔'' اصغری نے جواب دیا۔

''میرا خیال ہے خان صاحب جو کچھ کہتے ہیں درست ہی کہتے ہیں۔ واقعی ہم نے بچیوں کے مستقبل کا کچھ خیال نہیں کیا اور جو تمہیں اس میں برائی نظر آتی ہے تو ہمارے ہوتے ہوئے کوئی کیا کر سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں اس موقعے سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔"

''میں کچھ نہیں جانتی۔ تم مختار ہو جو چاہے کرو۔"

حیدری خان رات کو کوئی دس بجے کے قریب آیا۔ اصغری نے اس کے اور فیاض کے لئے کھانا گرم کیا۔ کھانے کے دوران فیاض نے مسجد کے امام سے اپنی ملاقات کا حال سنایا۔ حیدری سنتے ہی کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

''وہ تو میں پہلے ہی سمجھے ہوا تھا بیٹے' مگر تم کوئی فکر نہ کرو اپنے کام سے کام رکھو۔ جب دیکھیں گے کہ کوئی چارہ نہیں تو اس محلے ہی کو چھوڑ دیں گے۔"

یہ سن کر فیاض کی کچھ کچھ ہمت بندھی اور اس نے پھر ریاض شروع کر دیا۔

اس واقعہ کے دو دن بعد لڑکیوں کے ناچ گانے کی تعلیم شروع ہو گئی۔ اب محلے والوں کے کانوں میں ظہر سے لے کر عصر تک کچھ اس قسم کی آوازیں' گھنگھروؤں کی جھنکار کے ساتھ مل کر سنائی دینے لگی۔

تا تت تھئی تھئی' تا تت تھئی تھئی۔ ایک دو تین چار۔ ایک دو تین چار۔ تا تت تھئی تھئی۔ تا تت تھئی۔ ایک دو تین۔ ایک دو تین۔

اگلے روز جب نجمہ اور سلیمہ استانی کے ہاں پڑھنے گئیں تو پانچ ہی منٹ بعد بستے اٹھائے واپس آ گئیں۔ استانی نے بچیوں سے کہا تھا کہ تم یہاں نہ آیا کرو۔

اسی روز شام کو مالک مکان فیاض سے ملنے آیا۔ وہ سر جھکائے تھا۔ شرم کے مارے منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔ پچھلے دس برسوں میں اسے فیاض سے کسی قسم کی شکایت پیدا نہ ہوئی تھی۔ نہ فیاض نے کبھی مکان کی مرمت کے لئے کہا تھا' نہ سفیدی کرانے کے لئے اور کرایہ ہر مہینے بلا ناغہ پیشگی ہی اس کی دکان پر پہنچ جاتا تھا۔

"معاف کیجئے گا فیاض صاحب" آخر اس نے زبان کھولی۔ "میں آپ کی بڑی عزت کرتا ہوں خواہ آپ کو گانے بجانے کا شوق ہی کیوں نہ ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ خود مجھے بھی موسیقی سے دلچسپی ہے مگر کیا کروں ان کم بخت محلے داروں نے میری دکان پر آ آ کر میرا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ آپ کا نقشہ ایسے بھیانک طریقے سے کھینچتے ہیں گویا محلے بھر کی بہو بیٹیوں کی عزت خطرے میں پڑ گئی ہے۔ میں جانتا ہوں یہ سراسر جھوٹ ہے مگر اتنے آدمیوں کے سامنے مجھ اکیلے کی کچھ پیش نہیں چلتی۔ آپ جیسے شریف اور ایماندار کرایہ دار کو گنوا کر مجھے بڑا دکھ ہوگا مگر کیا کروں مجبور ہوں۔ امید ہے آپ میرا مطلب سمجھ گئے ہوں گے۔"

"میں سمجھ گیا ہوں۔" فیاض نے جواب دیا۔ "آپ فکر نہ کیجئے میں ہفتے بھر میں مکان خالی کر دوں گا۔"

جب یہ ماجرا حیدری خان کے کانوں تک پہنچا تو وہ بول اٹھا۔ "چلو یہ جھگڑا بھی نمٹا۔ فیاض بیٹے! ہم خود اس مکان میں رہنا نہیں چاہتے۔ شہر میں ایک سے ایک اچھا مکان موجود ہے اور کرایہ بھی کم۔"

"مگر خان صاحب مجھے مکان تلاش کرنے کی فرصت کہاں؟"

"تم فکر نہ کرو میری جان۔ آج کیا دن ہے جمعرات۔ بس اسی اتوار تک میں خود مکان تلاش کر لوں گا۔ اس دن تمہیں چھٹی بھی ہو گی۔ آسانی سے اسباب لے چلیں گے۔"

حیدری خان نے سچ مچ اتوار سے پہلے ہی مکان تلاش کر لیا۔ وہ فیاض کو مکان دکھانے لے گیا۔ جس علاقے میں یہ مکان تھا' وہ شہر سے الگ تھلگ مضافات کی سی کیفیت رکھتا تھا۔ فیاض کا اس علاقے میں کبھی جانا نہیں ہوا تھا۔ بازار خوب چوڑا تھا۔ آمنے سامنے اونچے اونچے مکان' نیچے دکانیں' کسی میں بنیا' کسی میں قصاب' کسی میں کنجڑا' یساطی تنبولی بزاز۔ ان تمام اشیاء کی دکانیں جنہیں خریدنے کے لئے فیاض کو لمبی لمبی گلیاں طے کرنی پڑتی تھیں۔ علاوہ ازیں جوتے والوں کی دکانیں' درزیوں کی دکانیں' لانڈری والے' کیمسٹ' ایک کارخانہ بسکٹ بنانے کا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک یتیم خانہ تھا اور ایک جگہ حکیم بھورے خان میاں کے مطب کا بورڈ لگا تھا۔

ان دکانوں کے اوپر خوبصورت پختہ مکان تھے کوئی تین منزل کا تو کوئی چار منزل کا۔ زیادہ تر مکانوں کے دروازے اور کھڑکیاں یا تو بند تھیں یا ان پر چلمنیں پڑی تھیں۔

اس نواح میں حیدری خان نے فیاض کے لئے دو کمروں کا ایک فلیٹ تلاش کیا تھا۔ یہ ایک عمارت کی دوسری منزل پر تھا جس کے نیچے ایک ایرانی چائے خانہ تھا۔ فلیٹ کے دونوں کمرے صاف ستھرے اور کشادہ تھے۔ بجلی اور نل کا انتظام۔ ٹائلوں کے فرش چوڑے

چوڑے دروازے۔ کھلی کھلی کھڑکیاں' ان کے روشن دانوں میں سرخ سبز نیلے پیلے رنگوں کے شیشے کٹا یودار پھولوں کی وضع کے لگے تھے۔ بازار کے رخ ایک خوبصورت بالکونی تھی۔ اسے دیکھ کر فیاض کی باچھیں کھل گئیں۔ یہاں وہ گرمی کے دنوں میں چھوٹی سے چوکی بچھا کر سرود کا ریاض کیا کرے گا۔ وہ مارے خوشی کے استاد سے لپٹ گیا۔

''فیاض بیٹے'' حیدری خان نے اس کے خیال کو بھانپتے ہوئے کہا۔ ''یہاں تمہیں کوئی نہیں روکے گا۔ جی چاہے تو ساری رات سرود بجاتے رہو۔''

فیاض خوشی خوشی اصغری کو یہ مژدہ سنانے گھر آیا۔ مکان کی اتنی بہت خوبیاں سن کر اصغری اور نجمہ وسلیمہ کو بھی اس کے دیکھنے کا اشتیاق ہوا مگر حیدری خان نے کہا۔ ''بس ایک ہی دفعہ چل کے دیکھ لینا۔ فوراً اسباب باندھنا شروع کردو۔ تاکہ تیسرے پہر تک وہاں پہنچ جائیں۔''

دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر فیاض' حیدری خان' اصغری اور دونوں لڑکیاں جلدی جلدی اسباب باندھنے میں مصروف ہو گئیں۔ پچھلے دس برس میں نہ جانے کیا کیا ضروری اور غیر ضروری سامان اکٹھا ہو گیا تھا جس کا چھانٹنا مشکل تھا۔ صلاح یہ ٹھہری کہ نئے مکان میں پہنچ کر چھانٹ لیں گے۔ فی الحال تو سارے کا سارا جوں کا توں وہاں پہنچا دیا جائے۔ پھر بھی سامان باندھتے باندھتے اور ٹھیلا آتے آتے چار بج ہی گئے۔ جس وقت یہ لوگ اپنے نئے مکان میں پہنچے تو شام ہونے کو تھی۔

فیاض اس کی بیوی اور بیٹیاں صبح سے کام کرتے کرتے ایسی تھک گئی تھیں کہ انہوں نے مکان کا جائزہ بھی نہ لیا۔ چاروں ایک کمرے میں بڑی سی دری بچھا کر اس پر پڑ رہے۔ مگر حیدری خان کے چہرے سے تھکاوٹ کے کچھ آثار ظاہر نہ ہوتے تھے' وہ کہیں جانے کی سوچ رہا تھا۔

''فیاض بیٹے! اندر سے کنڈی لگا لینا۔'' اس نے سیڑھیوں کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ ''میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ جب تک میں نہ آؤں کنڈی نہ کھولنا۔ اگر مجھے دیر ہو جائے تو گھبرانا نہیں۔''

یہ کہہ کر وہ سیڑھیوں سے اتر گیا۔ اس کے جانے کی دیر تھی کہ چاروں کو نیند نے آ دبوچا اور وہ دو ڈھائی گھنٹے خوب بے خبر سوتے رہے۔ سب سے پہلے فیاض کی آنکھ کھلی اس نے خود کو گھٹا ٹوپ اندھیرے میں پایا۔ وہ جانتا تھا کہ دیوار پر بجلی کا بٹن کہاں ہے۔ مگر اس خیال سے اس نے روشنی نہ کی کہیں اصغری اور بچیوں کی نیند نہ اچٹ جائے' وہ اندھیرے میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا بالکونی کی طرف گیا اور اس کے آہنی کٹہرے پر جھک کر اس نواح کی سیر دیکھنے لگا۔ آمنے سامنے اغل بغل نیچے اوپر جس طرف بھی اس کی نظر گئی

اسے ایک نئی ہی کیفیت دکھائی دی۔ اس نے دیکھا کہ آس پاس کے تمام فلیٹوں میں بجلی کی تیز روشنی ہو رہی ہے اور کمروں کے دروازے اور کھڑکیاں جن پر دن کو چقیں پڑی تھیں' اب چوپٹ کھلے ہیں۔ جو کمرہ اس کے فلیٹ کے عین سامنے تھا اس میں اجلی چاندنی کا فرش بچھا تھا۔ گاؤ تکئے لگے ہیں۔ پاندان خاصدان پیچوان قرینے سے رکھے ہیں اور وہ سارا اہتمام ہے جو کسی دعوت کے موقع پر کیا جاتا ہے مگر یہ کمرہ ابھی اپنے مکینوں سے خالی ہے۔

ادھر سے ہٹ کر اب اس کی نظر نیچے بازار پر پڑی۔ اس وقت وہاں کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ وہ دکانیں جن میں دن کو آٹا' دال' گھی' گوشت' سبزی' کپڑا' سونا' چاندی' تانبا' پیتل بکتا تھا وہ تو سب بند تھیں اور ان کے ٹھکانوں پر گل فروش چنگیروں میں طرح طرح کے ہار گجرے کنگن چمپا کلی وغیرہ پھولوں کے گہنے سجائے دکان لگائے بیٹھے ہیں۔ گندھیوں نے اپنی بڑی بڑی پٹاریاں کھول رکھی تھیں۔ ان کی چھوٹی چھوٹی عطر کی رنگ برنگی شیشیاں دور سے چمکتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔

ایک جگہ مٹھائی کے بڑے بڑے تھال چنے ہوئے تھے جن میں قسم قسم کے لڈو قلاقند اور جلیبیاں سجی تھیں۔ امرتی اور برفی کے قلعے بنے تھے۔ یتیم خانے کا پھاٹک بند تھا۔ اس کے باہر اس وقت نظر بندی کا تماشا ہو رہا تھا۔ ایک جگہ ایک نوجوان جو شاید نابینا تھا' گاندھی ٹوپی پہنے ہارمونیم بجا کر گا رہا تھا۔ پاس ہی چادر پر اکنیاں دونیاں ٹکے پیسے بکھرے پڑے تھے۔ ہر شخص خوش طبعی کے سبھاؤ میں تھا۔ میلے کا سماں بندھا ہوا تھا۔ بازار میں خاصی بھیڑ تھی جب کوئی بڑی سی چمکتی ہوئی موٹر پوں پوں کرتی ہوئی گزرتی تو لوگ سامنے سے یوں ہٹ جاتے جیسے سمندر میں دخانی کشتی کے چلنے سے جاگ چھٹ جاتے ہیں۔

فیاض کو اپنے فلیٹ کے سامنے جو کمرہ خالی نظر آیا تھا اب اس میں چہل پہل ہونے لگی تھی۔ لوگ آتے جاتے تھے اور گاؤ تکیوں سے لگ لگ کر بیٹھتے جاتے تھے۔ یکبارگی طبلے کی تھاپ پڑی اور ایک غیرت ناہید رو پہلی پشواز پہنے چھم سے محفل میں کودی اور رقص کرنے لگی۔ ہاتھ پاؤں کی چلت پھرت اس غضب کی تھی کہ ہر ہر ادا پر دیکھنے والوں کے دل مسلے جاتے۔ تحسین کی صدائیں بلند ہوتیں۔ مگر رقاصہ کو اپنے حسن اور اپنے کمالِ فن پر ایسا ناز تھا کہ وہ ہر توصیف سے بے نیاز معلوم ہوتی تھی۔

فیاض ایک حیرت کے عالم میں بالکونی پر کھڑا یہ ماجرا دیکھ رہا تھا کہ اسے محسوس ہوا جیسے اندھیرے میں کوئی سایہ سا اس کے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا ہے۔ فیاض کچھ لمحہ ساکت و جامد کھڑا رہا۔ سائے نے بھی کوئی حرکت نہ کی۔ آخر اس نے گردن پھیر کر دیکھا تو وہ اس کی بیوی اصغری تھی۔



آنندی

بلدیہ کا اجلاس زوروں پر تھا۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اور خلاف معمول ایک ممبر بھی غیر حاضر نہ تھا۔ بلدیہ کے زیر بحث مسئلہ یہ تھا کہ زنان بازاری کو شہر بدر کر دیا جائے کیونکہ ان کا وجود انسانیت' شرافت اور تہذیب کے دامن پر بدنما داغ ہے۔

بلدیہ کے ایک بھاری بھر کم رکن جو ملک وقوم کے سچے خیر خواہ اور دردمند سمجھے جاتے تھے نہایت فصاحت سے تقریر کر رہے تھے۔

"......اور پھر حضرات آپ یہ بھی خیال فرمایئے کہ ان کا قیام شہر کے ایک ایسے حصے میں ہے جو نہ صرف شہر کے بیچوں بیچ عام گزرگاہ ہے بلکہ شہر کا سب سے بڑا تجارتی مرکز بھی ہے۔ چنانچہ ہر شریف آدمی کو چاروناچار اس بازار سے گزرنا پڑتا ہے۔ علاوہ ازیں شرفاء کی پاک دامن بہو بیٹیاں اس بازار کی تجارتی اہمیت کی وجہ سے یہاں آنے اور خرید و فروخت کرنے پر مجبور ہیں۔ صاحبان! جب یہ شریف زادیاں ان آبرو باختہ' نیم عریاں بیسواؤں کے بناؤ سنگھار کو دیکھتی ہیں تو قدرتی طور پر ان کے دل میں بھی آرائش و دلربائی کی نئی نئی امنگیں اور ولولے پیدا ہوتے ہیں اور اپنے غریب شوہروں سے طرح طرح کے غازوں' لونڈروں' زرق برق ساڑھیوں اور قیمتی زیورات کی فرمائشیں کرنے لگتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کا پرمسرت گھر' ان کا راحت کدہ ہمیشہ کے لئے جہنم کا نمونہ بن جاتا ہے۔

......اور صاحبان پھر آپ یہ بھی تو خیال فرمایئے کہ ہمارے نونہالان قوم جو درس گاہوں میں تعلیم پا رہے ہیں اور جن کی آئندہ ترقیوں سے قوم کی امیدیں وابستہ ہیں۔ اور قیاس چاہتا ہے کہ ایک نہ ایک دن قوم کی کشتی کو بھنور سے نکالنے کا سہرا ان ہی کے سر بندھے گا۔ انہیں صبح شام اسی بازار سے ہو کر آنا جانا پڑتا ہے۔ یہ قحبائیں جو ہر وقت بارہ ابھرن سولہ سنگھار کئے راہرو پر بے حجابانہ نگاہ و مژہ کے تیر و سناں برساتی اور اسے دعوت دیتی ہیں۔ کیا انہیں دیکھ کر ہمارے بھولے بھالے ناتجربہ کار جوانی کے نشے میں سرشار سود و زیاں سے بے پرواہ نونہالان قوم اپنے جذبات و خیالات اور اپنی اعلیٰ سیرت کو معصیت کے مسموم اثرات سے محفوظ رکھ سکتے ہیں؟ صاحبان کیا ان کا حسن زاہد فریب ہمارے نونہالان قوم کو جادہ مستقیم سے بھٹکا کر' ان کے دل میں گناہ کی پراسرار لذتوں کی تشنگی پیدا کر کے ایک بے کلی' ایک اضطراب' ایک ہیجان برپا نہ کر دیتا ہوگا۔"

اس موقع پر ایک رکن بلدیہ جو کسی زمانہ میں مدرس رہ چکے تھے اور اعداد و شمار سے خاص شغف رکھتے تھے بول اٹھے۔ "صاحبان

واضح رہے کہ امتحانوں میں ناکام رہنے والے طلبہ کا تناسب پچھلے پانچ سال کی نسبت ڈیوڑھا ہو گیا ہے۔"

ایک رکن نے جو چشمہ لگائے تھے اور مہینہ وار اخبار کے مدیر اعزازی تھے تقریر کرتے ہوئے کہا۔ "ہمارے شہر سے روز بروز غیرت' شرافت' مردانگی' نکوکاری و پرہیز گاری اٹھتی جا رہی ہے اور اس کی بجائے بے غیرتی' نامردی' بزدلی' بدمعاشی' چوری اور جعل سازی کا دور دورہ ہوتا جا رہا ہے' منشیات کا استعمال بہت بڑھ گیا ہے۔ قتل و غارت خودکشی اور دیوالہ نکلنے کی وارداتیں بڑھتی جا رہی ہیں۔ اس کا سبب محض ان کی زنان بازاری کا ناپاک وجود ہے۔ کیونکہ ہمارے بھولے بھالے شہری ان کی زلف گرہ گیر کے سیر ہو کر ہوش و خرد کھو بیٹھے ہیں اور ان کی بارگاہ تک رسائی کی زیادہ سے زیادہ قیمت ادا کئے ہر جائز و ناجائز طریق سے زر حاصل کرتے ہیں بعض اوقات وہ اس سعی و کوشش میں جامہ انسانیت سے باہر ہو جاتے ہیں اور قبیح افعال کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ جان عزیز سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں اور یا جیل خانوں میں پڑے سڑتے ہیں۔"

ایک پنشن یافتہ معمر رکن جو ایک وسیع خاندان کے سرپرست تھے اور دنیا کا سرد و گرم دیکھ چکے تھے اور اب کشمکش حیات سے تھک کر باقیماندہ عمر ستانے اور اپنے اہل و عیال کو اپنے سایہ میں پنپتا ہوا دیکھنے کے متمنی تھے' تقریر کرنے اٹھے۔ ان کی آواز لرزتی ہوئی تھی اور لہجہ فریاد لئے ہوئے تھا۔ بولے "صاحبان رات رات بھر ان لوگوں کی طبلے کی تھاپ' ان کی گلے بازیاں' ان کے عشاق کی دھینگا مشتی' گالی گلوچ' شور و غل' ہا ہا ہا ہو ہو ہو سن کر آس پاس کے رہنے والے شرفاء کے کان پک گئے ہیں۔ ضیق میں جان آ گئی ہے۔ رات کی نیند حرام ہے تو دن کا چین مفقود۔ علاوہ ازیں ان کے قرب سے ہماری بہو بیٹیوں کے اخلاق پر جو برا اثر پڑتا ہے اس کا اندازہ ہر صاحب اولاد خود کر سکتا ہے۔"

آخری فقرہ کہتے کہتے ان کی آواز بھر گئی اور وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکے۔ سب اراکین بلدیہ کو ان سے ہمدردی تھی۔ کیونکہ بدقسمتی سے ان کا مکان اس بازار حسن کے عین وسط میں واقع تھا۔

ان کے بعد ایک رکن بلدیہ نے جو پرانی تہذیب کے علمبردار تھے اور آثار قدیمہ کو اولاد سے زیادہ عزیز رکھتے تھے' تقریر کرتے ہوئے کہا۔

"حضرات! باہر سے جو سیاح اور ہمارے احباب ہمارے اس مشہور اور تاریخی شہر کو دیکھنے آتے ہیں۔ جب وہ اس بازار سے گزرتے اور اس کے متعلق استفسار کرتے ہیں تو یقین کیجئے کہ ہم پر گھڑوں پانی پڑ جاتا ہے۔"

اب صدر بلدیہ تقریر کرنے اٹھے۔ گو قد ٹھگنا اور ہاتھ پاؤں چھوٹے چھوٹے تھے مگر سر بڑا تھا جس کی وجہ سے بردبار آدمی معلوم

ہوتے تھے۔ لہجے میں حد درجہ متانت تھی۔ بولے ''حضرات! میں اس امر میں قطعی طور پر آپ سے متفق ہوں کہ اس طبقہ کا وجود ہمارے شہر اور ہمارے تہذیب وتمدن کے لیے باعث صد عار ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اس کا تدارک کس طرح کیا جائے۔ اگر ان لوگوں کو مجبور کیا جائے کہ یہ اپنا ذلیل پیشہ چھوڑ دیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ لوگ کھائیں گے کہاں سے؟''

ایک صاحب بول اٹھے۔ ''یہ عورتیں شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟''

اس پر ایک طویل فرمائشی قہقہہ پڑا اور ہال کی ماتمی فضا میں یکبارگی شگفتگی کے آثار پیدا ہو گئے۔ جب اجلاس میں خاموشی ہوئی تو صاحب صدر بولے۔ ''حضرات یہ تجویز بارہا ان لوگوں کے سامنے پیش کی جا چکی ہے۔ اس کا ان کی طرف سے یہ جواب دیا جاتا ہے کہ آسودہ اور عزت دار لوگ خاندانی حرمت وناموس کے خیال سے انہیں اپنے گھروں میں گھسنے نہ دیں گے اور مفلس اور ادنیٰ طبقہ کے لوگوں کو جو محض ان کی دولت کے لیے ان کی شادی کرنے پر آمادہ ہوں گے یہ عورتیں خود منہ نہیں لگائیں گی۔''

اس پر ایک صاحب بولے۔ ''بلدیہ کو ان کے نجی معاملوں میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ بلدیہ کے سامنے تو یہ مسئلہ ہے کہ یہ لوگ چاہے جہنم میں جائیں مگر اس شہر کو خالی کر دیں۔''

صدر نے کہا۔ ''صاحبان! یہ بھی آسان کام نہیں ہے۔ ان کی تعداد دس بیس نہیں سینکڑوں تک پہنچتی ہے اور پھر ان میں سے بہت سے عورتوں کے ذاتی مکانات ہیں۔''

یہ مسئلہ کوئی مہینے بھر تک بلدیہ کے زیر بحث رہا۔ اور بالآخر تمام اراکین کے اتفاق رائے سے یہ امر قرار پایا کہ زنان بازاری کے مملوکہ مکانوں کو خرید لینا چاہیے اور انہیں رہنے کے لئے شہر سے کافی دور کوئی الگ تھلگ علاقہ دیا جانا چاہیے۔ ان عورتوں نے بلدیہ کے اس شہر فیصلے کے خلاف سخت احتجاج کیا بعض نے نافرمانی کر کے بھاری جرمانے اور قیدیں بھگتیں مگر بلدیہ کی مرضی کے آگے ان کی کوئی پیش نہ چل سکی اور وہ ناچار صبر کر کے رہ گئیں۔

اس کے بعد ایک عرصہ تک ان زنان بازاری کے مملوکہ مکانوں کی فہرستیں اور نقشے تیار ہوتے اور مکانوں کے گاہک پیدا کیے جاتے رہے۔ بیشتر مکانوں کو بذریعہ نیلام فروخت کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ان عورتوں کو چھ مہینے تک شہر میں اپنے پرانے ہی مکانوں میں رہنے کی اجازت دی دے گئی تا کہ اس عرصے میں وہ علاقہ میں مکان وغیرہ بنوا سکیں۔ ان عورتوں کے لئے جو علاقہ منتخب کیا گیا۔ وہ شہر سے چھ کوس دور تھا۔ پانچ کوس تک پکی سڑک جاتی تھی اور اس سے آگے کوس بھر کا کچا راستہ تھا۔ کسی زمانہ میں وہاں کوئی بستی ہوگی مگر اب تو کھنڈروں کے سوا کچھ نہ رہا تھا۔ جن میں سانپوں اور چمگادڑوں کے مسکن تھے اور دن دیہاڑے الو بولتا تھا۔ اس علاقے کے

نواح میں کچے گھروندوں والے کئی چھوٹے چھوٹے گاؤں تھے۔ کسی کا فاصلہ بھی یہاں سے دو ڈھائی میل سے کم نہ تھا۔ ان گاؤں کے بسنے والے کسان دن کے وقت کھیتی باڑی کرتے' یا یونہی پھرتے پھراتے ادھر نکل آتے تو نکل آتے ورنہ عام طور پر اس شہر خموشاں میں آدم زاد کی صورت نظر نہ آتی تھی۔ بعض اوقات روز روشن ہی میں گیدڑ اس علاقے میں پھرتے دیکھے گئے تھے۔

پانسو سے کچھ اوپر بیسواؤں میں سے صرف چودہ ایسی تھیں جو اپنے عشاق کی وابستگی یا خود اپنی دل بستگی یا کسی اور وجہ سے شہر کے قریب آزادانہ رہنے پر مجبور تھیں اور اپنے دولت مند چاہنے والوں کی مستقل مالی سرپرستی کے بھروسے با دل نخواستہ اس علاقہ میں رہنے پر آمادہ ہو گئی تھیں۔ ورنہ باقی عورتوں نے سوچ رکھا تھا کہ وہ یا تو اسی شہر کے شریف محلوں کے کونوں کھالیوں میں جا چھپیں گی یا پھر اس شہر ہی کو چھوڑ کہیں اور نکل جائیں گی۔

یہ چودہ اچھی خاصی مالدار تھیں۔ اس پر شہر میں ان کے جو مملوکہ مکان تھے ان کے دام انہیں اچھے وصول ہو گئے تھے اور اس علاقے میں زمین کی قیمت برائے نام تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے ملنے والے دل وجان سے ان کی مالی امداد کرنے کے لیے تیار تھے چنانچہ انہوں نے اس علاقے میں جی کھول کر بڑے عالی شان مکان بنوانے کی ٹھان لی۔ ایک اونچی اور ہموار جگہ جو ٹوٹی پھوٹی قبروں سے ہٹ کر تھی' منتخب کی گئی۔ زمین کے قطعے صاف کرائے اور چابدست نقشہ نویسوں سے مکانوں کے نقشے بنوائے گئے اور چند ہی روز میں تعمیر کا کام شروع ہو گیا۔

دن بھر اینٹ' مٹی' چونا' شہتیر' گارڈر اور دوسرا عمارتی سامان لاریوں' چھکڑوں' خچروں' گدھوں اور انسانوں پر لد کر اس بستی میں آتا اور منشی حساب کتاب کی کاپیاں بغلوں میں دبائے انہیں گنواتے اور کاپیوں میں درج کرتے۔ مہر عمارت معماروں کو کام کے متعلق ہدایات دیتے۔ معمار مزدوروں کو ڈپٹتے' مزدور ادھر ادھر دوڑتے پھرتے۔ مزدورنیوں کو چلا چلا کر پکارتے اور اپنے ساتھ کام کرنے کے لئے بلاتے۔ غرض سارا دن ایک شور' ایک ہنگامہ رہتا اور سارا دن آس پاس کے گاؤں کے دیہاتی اپنے کھیتوں میں دیہاتیں اپنے گھروں میں ہوا کے جھونکوں کے ساتھ دور آتی ہوئی کھٹ کھٹ کی دھیمی آوازیں سنتی رہتیں۔

اس بستی کے کھنڈروں میں ایک جگہ مسجد کے آثار تھے اور اس کے پاس ہی ایک کنواں تھا جو بند پڑا تھا۔ راج مزدوروں نے کچھ تو پانی حاصل کرنے اور بیٹھ کر سستانے کی غرض سے اور کچھ ثواب کمانے اور اپنے نمازی بھائیوں کی عبادت گزاری کے خیال سے سب سے پہلے اسی کی مرمت کی۔ چونکہ یہ فائدہ بخش اور ثواب کا کام تھا اس لئے کسی نے کچھ اعتراض نہ کیا۔ چنانچہ دو تین روز میں مسجد تیار ہو گئی۔

دن کو بارہ بجے ہی کھانا کھانے کی چھٹی ہوتی۔ دو ڈھائی سو راج' مزدور' میر عمارت' منشی اور ان بیسواؤں کے رشتہ دار یا کارندے جو تعمیر کی نگرانی پر مامور تھے' اس مسجد کے آس پاس جمع ہو جاتے اور اچھا خاصہ میلہ سا لگ جاتا۔

ایک دن ایک دیہاتی بڑھیا جو پاس کے کسی گاؤں میں رہتی تھی اس بستی کی خبر سن کر آ گئی۔ اس کے ساتھ ایک خوردسال لڑکا تھا۔ دونوں نے مسجد کے قریب ایک درخت کے نیچے گھٹیا سگریٹ' بیڑی اور گڑ کی بنی ہوئی مٹھائیوں کا خوانچہ لگا دیا۔ بڑھیا کو آئے ہوئے ابھی دو دن بھی نہ گزرے تھے کہ ایک بوڑھا کسان کہیں سے ایک مٹکا اٹھا لایا اور کنویں کے پاس اینٹوں کا ایک چھوٹا سا چبوترا بنا کر پیسے کے دو دو شکر کے شربت کے گلاس بیچنے لگا۔ ایک کنجڑے کو جو خبر ہوئی وہ ایک ٹوکرے میں خربوزے بھر کر لے آیا اور خوانچہ والی بڑھیا کے پاس بیٹھ کر' لے لو خربوزے شہد سے میٹھے خربوزے کی صدا لگانے لگا۔ ایک شخص نے کیا کیا' گھر سے سری پائے پکا' دیگچی میں رکھ' خوانچہ میں لگا' تھوڑی سی روٹیاں مٹی کے دو تین پیالے اور ٹین کا ایک گلاس لے کے آ موجود ہوا اور اس بستی کے کارکنوں کو جنگل میں گھر کی ہنڈیا کا مزا چکھانے لگا۔

ظہر اور عصر کے وقت میر عمارت' منشی' معمار اور دوسرے لوگ مزدوروں سے کنویں سے پانی نکلوا نکلوا کر وضو کرتے نظر آتے۔ ایک شخص مسجد میں جا کر اذان دیتا۔ پھر ایک کو امام بنایا جاتا اور دوسرے لوگ اس کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھتے۔ کسی گاؤں میں ایک ملا کے کان میں جو یہ بھنک پڑی کہ فلاں مسجد میں امام کی ضرورت ہے۔ وہ دوسرے ہی دن علی الصبح ایک سبز جزدان میں قرآن شریف' پنج سورہ' رحل اور مسئلے مسائل کے چند چھوٹے چھوٹے رسالے رکھ کر آ موجود ہوا اور اس مسجد کی امامت باقاعدہ طور پر اسے سونپ دی گئی۔

ہر روز تیسرے پہر گاؤں کا ایک کبابی سر پر اپنے سامان ٹوکرا اٹھائے اور خوانچہ والی بڑھیا کے پاس زمین پر چولہا بنا کباب' کلیجی' دل اور گردے سیخوں پر چڑھا بستی والوں کے ہاتھ بیچتا۔ ایک بھٹیاری نے جو یہ حال دیکھا تو اپنے میاں کو ساتھ لے مسجد کے سامنے میدان میں دھوپ سے بچنے کے لئے پھونس کا ایک چھپر ڈال کر تنور گرم کرنے لگی کبھی کبھی ایک نوجوان دیہاتی نائی چھٹی پرانی کسبت گلے میں ڈالے جوتی کی ٹھوکروں سے راستے روڑوں کو لڑھکاتا ادھر ادھر گشت کرتا دیکھنے میں آ جاتا۔

ان بیسواؤں کے مکانوں کی تعمیر کی نگرانی' ان کے رشتہ دار یا کارندے تو کرتے ہی تھے کسی کسی دن وہ دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر اپنے عشاق کے ہمراہ خود بھی اپنے مکانوں کو بنتا دیکھنے آ جاتیں اور غروب آفتاب سے پہلے یہاں سے نہ جاتیں۔ اس موقع پر فقیروں اور فقیرنیوں کی ٹولیوں کی ٹولیاں نہ جانے کہاں سے آ جاتیں اور جب تک خیرات نہ لے لیتیں اپنی صداؤں سے برابر شور

محاتی رہتیں اور انہیں بات نہ کرنے دیتیں۔ کبھی کبھی شہر کے لفنگے اوباش و بیکار مباش کچھ کیا کر کے مصداق شہر سے پیدل چل کر بیسواؤں کی اس نئی بستی کی سن گن لینے آجاتے اور اگر اس دن بیسوائیں بھی آئی ہوتیں تو ان کی عید ہو جاتی۔ وہ ان سے دور ہٹ کر ان کے گرداگرد چکر لگاتے رہتے۔ فقرے کستے' بے تکے قہقہے لگاتے۔ عجیب عجیب شکلیں بناتے اور مجنونانہ حرکتیں کرتے۔ اس روز کباڑی کی خوب بکری ہوتی۔

اس علاقے میں جہاں پہلے ہی دن پہلے ہو کا عالم تھا اب ہر طرف گہما گہمی اور چہل پہل نظر آنے لگی۔ شروع شروع میں اس علاقہ کی ویرانی میں ان بیسواؤں کو یہاں آکر رہنے کے خیال سے جو وحشت ہوتی تھی وہ بڑی حد تک جاتی رہی تھی اور اب وہ ہر مرتبہ خوش خوش اپنے مکانوں کی آرائش اور اپنے مرغوب رنگوں کے متعلق معماروں کو تاکیدیں کر جاتی تھیں۔

بستی میں ایک جگہ ایک ٹوٹا پھوٹا مزار تھا جو قرائن سے کسی بزرگ کا معلوم ہوتا تھا۔ یہ مکان نصف سے زیادہ تعمیر ہو چکے تو ایک دن صبح کو بستی کے راج مزدوروں نے کا دیکھا کہ مزار کے پاس دھواں اٹھ رہا ہے اور ایک سرخ سرخ آنکھوں والا لمبا تڑنگا مست فقیر لنگوٹ باندھے چار ابرو کا صفایا کرائے' اس مزار کے اردگرد پھر رہا ہے اور کنکر پتھر اٹھا اٹھا کر پرے پھینک رہا ہے۔ دوپہر کو وہ فقیر ایک گھڑا لے کر کنویں پر آیا' اور پانی بھر بھر کر مزار پر لے جانے اور اسے دھونے لگا۔ ایک دفعہ جو آیا تو کنویں پر دو تین راج مزدور کھڑے تھے۔ وہ نیم دیوانگی اور نیم فرزانگی کے عالم میں ان سے کہنے لگا۔ ''جانتے ہو وہ کس کا مزار ہے؟ کڑک شاہ پیر بادشاہ کا' میرے باپ دادا ان کے مجاور تھے۔'' اس کے کے بعد اس نے ہنس ہنس کر آنکھوں میں آنسو بھر بھر کر پیر کڑک شاہ کی کچھ جلالی کراماتیں بھی ان راج مزدوروں سے بیان کیں۔

شام کو یہ فقیر کہیں سے مانگ تانگ کر مٹی کے دو دیے اور سرسوں کا تیل لے آیا اور پیر کڑک شاہ کی قبر کے سرہانے اور پائنتی چراغ روشن کر دیئے۔ رات کو پچھلے پہر کبھی کبھی اس مزار پر اللہ ھو کا مست نعرہ سنائی دے جاتا۔

چھ مہینے گزرنے نہ پائے تھے کہ یہ چودہ مکان بن کر تیار ہو گئے۔ یہ سب کے سب دو منزلہ اور قریب قریب ایک ہی وضع کے تھے۔ سات ایک طرف اور سات دوسری طرف۔ بیچ میں چوڑی چکلی سڑک تھی۔ ہر ایک مکان کے نیچے چار چار دکانیں تھیں۔ مکان کی بالائی منزل میں سڑک کے رخ وسیع برآمدہ تھا۔ اس کے آگے بیٹھنے کے لئے کشتی نما شہ نشین بنائی گئی تھی جس کے دونوں سروں پر یا تو سنگ مرمر کے مور رقص کرتے ہوئے بنائے گئے تھے اور یا جل پریوں کے مجسمے تراشے گئے تھے جن کا آدھا دھڑ مچھلی اور آدھا انسان کا تھا۔ برآمدہ کے پیچھے جو بڑا کمرہ بیٹھنے کے لئے تھا اس میں سنگ مرمر کے نازک ستون بنائے گئے تھے۔ دیواروں پر خوشنما

پچی کاری کی گئی تھی۔ فرش چمکدار پتھر کا بنایا گیا تھا۔ جب سنگ مرمر کے ستونوں کے عکس اس فرش زمردیں پر پڑتے تو ایسا معلوم ہوتا گویا سفید براق پروں والے راج ہنسوں نے اپنی اپنی لمبی گردنیں جھیل میں ڈبودی ہیں۔

بدھ کا شبھ دن اس بستی میں آنے کے لئے مقرر کیا گیا۔ اس روز اس بستی کی سب بیسواؤں نے مل کر بہت بھاری نیاز دلوائی' بستی کے کھلے میدان میں زمین کو صاف کرا کر شامیانے نصب کر دیئے گئے۔ دیگیں کھڑکنے کی آواز اور گوشت اور گھی کی خوشبو بیس بیس کوس سے فقیروں اور کتوں کو کھینچ لائی۔ دوپہر ہوتے ہوتے پیر کڑک شاہ کے مزار کے پاس جہاں لنگر تقسیم کیا جانا تھا اس قدر فقیر جمع ہو گئے کہ عید کے روز کسی بڑے کی جامع کے پاس بھی نہ ہوئے ہوں گے۔ پیر کڑک شاہ کے مزار کو خوب صاف کروایا اور دھلوایا گیا اور اس پر پھولوں کی چادر چڑھائی گئی اور اس مست فقیر کو نیا جوڑا سلوا کر پہنایا گیا جسے اس نے پہنتے ہی پھاڑ ڈالا۔

شام کو شامیانے کے نیچے دودھ سی اجلی چاندنی کا فرش کر دیا گیا۔ گاؤ تکیئے اور راگ رنگ کی محفل سجائی گئی۔ دور دور سے بہت سی بیسواؤں کو بلوایا گیا جو ان کی سہیلیاں یا برادری کی تھیں۔ ان کے ساتھ ان کے بہت سے ملنے والے بھی آئے جن کے لیے ایک الگ شامیانے میں کرسیوں کا انتظام کیا گیا اور ان کے سامنے کے رخ چقیں ڈال دی گئیں۔ بے شمار گیسوؤں کی روشنی سے یہ جگہ بقعہ نور بنی ہوئی تھی۔ ان بیسواؤں کے توندل سیاہ فام سازندے' زربفت اور کمخواب کی شیروانیاں پہنے' عطر میں بسے ہوئے پھوئے کانوں میں رکھے ادھر ادھر مونچھوں کو تاؤ دیتے پھرتے اور زرق برق لباسوں اور تتلی کے پر سے بھی باریک ساریوں میں ملبوس' غازوں اور خوشبوؤں میں بسی ہوئیں نازنیں اٹھکیلیوں سے چلتیں' رات بھر رقص اور سرود کا ہنگامہ برپا رہا اور جنگل میں منگل ہو گیا۔

دو تین دن کے بعد جب اس جشن کی تھکاوٹ اتر گئی تو یہ بیسوائیں ساز و سامان کی فراہمی اور مکانوں کی آرائش میں مصروف ہو گئیں۔ جھاڑ' فانوس' ظروف بلوری' قد آدم آئینے' نوازی پلنگ' تصویریں اور قطعات سنہری' چوکھٹوں میں جڑے ہوئے لائے گئے اور قرینے سے کمروں میں لگائے گئے اور کوئی آٹھ روز میں جا کر یہ مکان کیل کانٹے سے لیس ہوئے۔ یہ عورتیں دن کا بیشتر حصہ تو استادوں سے رقص و سرود کی تعلیم لینے' غزلیں یاد کرنے' دھنیں بٹھانے' سبق پڑھنے' تختی لکھنے' سینے پرونے' کاڑھنے' گراموفون سننے' استادوں سے تاش اور کیرم کھیلنے' ضلع جگت' نوک جھونک اور جی بہلانے سونے میں گزارتیں اور تیسرے پہر غسل خانوں میں نہانے جاتیں۔ جہاں ان کے ملازموں نے دستی پمپوں سے پانی نکال کر ٹب بھر رکھے ہوتے۔ اس کے بعد وہ بناؤ سنگھار میں مصروف ہو جاتیں۔

جیسے ہی رات کا اندھیرا پھیلتا یہ مکان گیسوں کی روشنی سے جگمگا اٹھتے جو جا بجا سنگ مرمر کے آدھے کھلے ہوئے کنولوں میں نہایت

صفائی سے چھپائے گئے تھے اور ان مکانوں کی کھڑکیوں اور دروازوں کے کواڑوں کے شیشے جو پھول پتیوں کی وضع کے کاٹ کر جڑے گئے تھے۔ان کی قوس قزح کے رنگوں کی سی روشنیاں دور سے جھلمل جھلمل کرتی نہایت بھلی معلوم ہوتیں۔ یہ بیسوائیں بناؤ سنگھار کئے برآمدوں میں ٹہلتی' آس پاس والیوں سے باتیں کرتیں ہنس کر کھلکھلاتیں۔ جب کھڑے کھڑے تھک جاتیں تو اندر کمرے میں چاندنی کے فرش پر گاؤ تکیوں سے لگ کر بیٹھ جاتیں۔ان کے سازندے ساز ملاتے رہتے اور یہ چھالیاں کترتی رہتیں۔جب رات ذرا بھیگ جاتی تو ان کے ملنے والے ٹوکروں میں شراب کی بوتلیں پھل پھلاری لئے اپنے دوستوں کے ساتھ موٹروں یا تانگوں میں بیٹھ کر آتے۔اس بستی میں ان کے قدم رکھتے ہی ایک خاص گہما گہمی اور چہل پہل ہونے لگتی۔نغمہ وسرود ساز کے سر رقص کرتی ہوئی نازنینوں کے گھنگھروؤں کی آواز قلقل مینا میں مل کر ایک عجیب سرور کی سی کیفیت پیدا کر دیتی۔عیش ومستی کے ان ہنگاموں میں معلوم بھی نہ ہوتا اور رات بیت جاتی۔

ان بیسواؤں کو اس بستی میں آئے چند ہی روز ہوئے تھے کہ دکانوں کے کرایہ دار پیدا ہو گئے جن کا کرایہ اس بستی کو آباد کرنے کے خیال سے بہت ہی کم رکھا گیا تھا۔سب سے پہلے جو دکاندار آیا وہ وہی بڑھیا تھی جس نے سب سے پہلے مسجد کے سامنے درخت کے نیچے خوانچہ لگایا تھا۔دکان کو پر کرنے کے لئے بڑھیا اور اس کا لڑکا سگریٹوں کے بہت سے خالی ڈبے اٹھا لائے اور اسے ممبر کے طاقوں میں سجا کر رکھ دیا گیا۔ بوتلوں میں رنگ دار پانی بھر دیا گیا تاکہ معلوم ہو کہ شربت کی بوتلیں ہیں۔ بڑھیا نے اپنی بساط کے مطابق کاغذی پھولوں اور سگریٹ کی خالی ڈبیوں سے بنائی ہوئی بیلوں سے دکان کی کچھ آرائش بھی کی۔بعض ایکٹروں اور ایکٹرسوں کی تصویریں بھی پرانے فلمی رسالوں سے نکال کر لئی سے دیواروں پر چپکا دیں۔دکان کا اصل مال دو تین قسم کے سگریٹ تین تین چار چار پیکٹوں' بیڑی کے آٹھ دس بنڈلوں' دیا سلائی کی نصف درجن ڈبیوں' پانی کی ڈھولی' پینے کے تمباکو کی تین چار ٹکیوں اور موم بتی کے نصف بنڈل سے زیادہ نہ تھا۔

دوسری دکان میں ایک بنیا' تیسری میں حلوائی اور شیر فروش' چوتھی میں قصائی' پانچویں میں کبابی اور چھٹی میں ایک کنجڑا آ بسے۔ کنجڑا آس پاس کے دیہات سے سستے داموں چار پانچ قسم کی سبزیاں لے آتا اور یہاں خاصے منافع پر بیچ دیتا۔ایک آدھ ٹوکرا پھلوں کا بھی رکھ لیتا۔ چونکہ دکان خاصی کھلی تھی ایک پھول والا اس کا ساتھی بن گیا۔وہ دن بھر پھولوں کے ہار گجرے اور طرح طرح کے گہنے بناتا رہتا اور شام کو انہیں چنگیر میں ڈال کر ایک ایک مکان پر لے جاتا اور نہ صرف پھول ہی بیچ آتا بلکہ ہر جگہ ایک ایک دو دو گھڑی بیٹھ سازندوں سے گپ شپ بھی ہانک لیتا اور حقے کے دم بھی لگا آتا۔جس دن تماش بینوں کی کوئی ٹولی اس کی موجودگی ہی میں کوٹھے پر

چڑھ آتی اور گانا بجانا شروع ہو جاتا تو وہ سازندوں کے ناک بھوں چڑھانے کے باوجود گھٹنوں اٹھنے کا نام نہ لیتا' مزے سے گانے پر سر دھنتا اور بیوقوفوں کی طرح ایک ایک کی صورت تکتا رہتا۔ جس دن رات زیادہ گزر جاتی اور کوئی ہار بچ رہتا تو اسے اپنے گلے میں ڈال لیتا اور بستی کے باہر گلا پھاڑ پھاڑ کر گاتا پھرتا۔

ایک دکان میں ایک بیسوا کا باپ اور بھائی جو درزیوں کا کام جانتے تھے' سینے کی ایک مشین رکھ کر بیٹھ گئے۔ ہوتے ہوتے ایک حجام بھی آ گیا اور اپنے ساتھ ایک رنگریز کو بھی لیتا آیا۔ اس کی دکان کے باہر الگنی پر لٹکتے ہوئے طرح طرح کے رنگوں کے دوپٹے ہوا میں لہراتے ہوئے آنکھوں کو بہت بھلے معلوم ہونے لگے۔

چند ہی روز گزرے تھے کہ ایک ٹٹ پونجئے بساطی نے جس کی دکان شہر میں چلتی نہ تھی' بلکہ اسے دکان کا کرایہ نکالنا بھی مشکل ہو جاتا تھا شہر کو خیر باد کہہ کر اس بستی کا رخ کیا۔ یہاں اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور اس کے طرح طرح کے یونڈر' قسم قسم کے پاؤڈر' صابن' کنگھیاں' بٹن' سوئی' دھاگا' لیس' فیتے' خوشبودار تیل' رومال' منجن کی خوب بکری ہونے لگی۔

اس بستی کے رہنے والوں کی سرپرستی اور ان کے مربیانہ سلوک کی وجہ سے اسی طرح دوسرے تیسرے روز کوئی نہ کوئی ٹٹ پونجیا دکاندار کوئی بزاز' کوئی پنساری' کوئی مچھ بند' کوئی نان بائی مندے کی وجہ سے یا شہر کے بڑھتے ہوئے کرایہ سے گھبرا کر اس بستی آ پناہ لیتا۔

ایک بڑے میاں عطار جو حکمت میں بھی کسی قدر دخل رکھتے تھے ان کا جی شہر کی گنجان آبادی اور حکیموں اور دواخانوں کی افراط سے جو گھبرایا تو وہ اپنے شاگردوں کو ساتھ لے شہر سے اٹھ آئے اور اس بستی میں ایک دوکان کرایہ پر لے لی۔ سارا دن بڑے میاں اور ان کے شاگرد دواؤں کے ڈبوں' شربت کی بوتلوں اور مربے' چٹنی اچار کے بویاموں کو الماریوں اور طاقوں میں اپنے اپنے ٹھکانے پر رکھتے رہے۔ ایک طاق میں طب اکبر قرابادین قادری اور دوسری طبی کتابیں جما کر رکھ دیں۔ کواڑوں کی اندرونی جانب اور دیواروں میں جو جگہ خالی بچی' وہاں انہوں نے اپنے خاص الخاص مجربات کے اشتہار سیاہ روشنائی سے جلی لکھ کر اور دفتیوں پر چپکا کر آویزاں کر دیئے۔ ہر روز صبح کو بیسواؤں کے ملازم گلاس لے کر آ موجود ہوتے اور شربت بزوری' شربت بنفشہ' شربت انار اور ایسے ہی نزہت بخش' روح افزا شربت' عرق' خمیرہ گاؤزبان اور تقویت پہنچانے والے مربے مع ورق ہائے نقرہ لے جاتے۔

جو دکانیں بچ رہیں ان میں ان بیسواؤں کے بھائی بندوں اور سازندوں نے اپنی چارپائیاں ڈال دیں۔ دن بھر یہ لوگ ان دکانوں میں تاش چوسر اور شطرنج کھیلتے' بدن پر تیل ملواتے' سبزی گھوٹتے' بٹیروں کی پالیاں کراتے' تیتروں سے سبحان تیری قدرت کی

رٹ لگواتے اور گھڑا بجا بجا کر گاتے۔

ایک بیسوا کے سازندے نے ایک دکان خالی دیکھ کر اپنے بھائی کو جو ساز بنانا جانتا تھا اس میں لا بٹھایا۔ دکان کی دیواروں کے ساتھ ساتھ کیلیں ٹھونک کر ٹوٹی پھوٹی مرمت طلب سارنگیاں' ستار' طنبورے' دلڑیا وغیرہ ٹانگ دیئے گئے۔ یہ شخص ستار بجانے میں بھی کمال رکھتا تھا۔ شام وہ اپنی دکان میں ستار بجاتا جس کی میٹھی آواز سن کر آس پاس کے دکاندار اپنی دکانوں سے اٹھ اٹھ کر آ جاتے اور دیر تک بت بنے ستار سنتے رہتے۔ اس ستار نواز کا ایک شاگرد تھا جو ریلوے کے دفتر میں کلرک تھا۔ اسے ستار سیکھنے کا بہت شوق تھا' جیسے ہی دفتر سے چھٹی ہوتی سیدھا سائیکل اڑاتا ہوا اس بستی کا رخ کرتا اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ دکان ہی میں بیٹھ کر مشق کیا کرتا غرض اس ستار نواز کے دم سے بستی میں خاصی رونق رہنے لگی۔

مسجد کے ملاجی' جب تک تو یہ بستی زیر تعمیر رہی رات کو دیہات میں اپنے گھر چلے جاتے رہے مگر اب جبکہ انہیں دونوں وقت مرغن کھانا بافراط پہنچنے لگا تو وہ رات کو بھی یہیں رہنے لگے۔ رفتہ رفتہ بیسواؤں کے گھروں سے بچے بھی مسجد میں پڑھنے آنے لگے جس سے ملاجی کو روپے پیسے کی آمدنی بھی ہونے لگی۔

ایک شہر شہر گھومنے والی گھٹیا درجہ کی تھیٹریکل کمپنی کو جب زمین کے چڑھے ہوئے کرایہ اور اپنی کم مائیگی کے باعث شہر میں کہیں جگہ نہ ملی تو اس نے اس بستی کا رخ کیا اور ان بیسواؤں کے مکانوں سے کچھ فاصلہ پر میدان پر تنبو کھڑے کر کے ڈیرے ڈال دیئے۔ اس کے ایکٹر ایکٹری کے فن سے محض نابلد تھے۔ ان کے ڈریس پھٹے پرانے تھے جن کے بہت سے ستارے جھڑ چکے تھے اور یہ لوگ تماشے بھی بہت پرانے اور دقیانوسی کرتے تھے مگر اس کے باوجود یہ کمپنی چل نکلی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ٹکٹ کے دام بہت کم تھے۔ شہر کے مزدوری پیشہ لوگ' کارخانوں میں کام کرنے والے اور غریب غرباء جو دن بھر کی کڑی محنت مشقت کی کسر شور وغل' سرمستیوں اور ادنیٰ عیاشیوں سے نکالنا چاہتے تھے۔ پانچ پانچ چھ چھ کی ٹولیاں بنا کر' گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے' ہنستے بولتے' بانسری اور الغوزے بجاتے' راہ چلتوں پر آوازے کستے' گالی گلوچ بکتے' شہر سے پیدل چل کر تھیٹر دیکھنے آتے اور لگے ہاتھوں بازار حسن کی سیر بھی کر جاتے۔ جب تک ناٹک شروع نہ ہوتا تھیٹر کا ایک مسخرہ تنبو کے باہر ایک اسٹول پر کھڑا کبھی کولہا ہلاتا' کبھی منہ پھلاتا' کبھی آنکھیں مٹکاتا۔ عجیب عجیب حیا سوز حرکتیں کرتا جنہیں دیکھ کر یہ لوگ زور سے قہقہے لگاتے اور گالیوں کی صورت میں داد دیتے۔

رفتہ رفتہ دوسرے لوگ بھی اس بستی میں آنے شروع ہوئے۔ چنانچہ شہر کے بڑے بڑے چوکوں میں تانگے والے صدائے لگانے لگے۔ ''آؤ کوئی نئی بستی کو'' شہر سے پانچ کوس تک جو پکی سڑک جاتی تھی اس پر پہنچ کر تانگے والے سواریوں سے انعام حاصل

کرنے کے لالچ میں یا ان کی فرمائش پر تانگوں کی دوڑیں کراتے۔ منہ سے ہارن دیتے اور جب کوئی تانگہ آگے نکل جاتا تو اس کی سواریاں نعروں سے آسمان سر پر اٹھا لیتیں۔ اس دور میں غریب گھوڑوں کا برا حال ہو جاتا اور ان کے گلے میں پڑے ہوئے پھولوں کے ہاروں سے بجائے خوشبو کے پسینے کی بدبو آنے لگتی۔

رکشا والے تانگے والوں سے کیوں پیچھے رہتے۔ وہ ان سے کم دام پر سواریاں بٹھا' طرارے بھرتے اور گھنگھرو بجاتے اس بستی کو جانے لگتے۔ علاوہ ازیں ہر ہفتے کی شام کو اسکولوں اور کالجوں کے طلباء ایک ایک سائیکل پر دو دو لدے' جوق در جوق اس پراسرار بازار کی سیر دیکھنے آتے جس سے ان کے خیال کے مطابق ان کے بڑوں نے خواہ مخواہ انہیں محروم کر دیا تھا۔

رفتہ رفتہ اس بستی کی شہرت چاروں طرف پھیلنے اور مکانوں اور دکانوں کی مانگ ہونے لگی۔ وہ بیسوائیں جو پہلے اس بستی میں آنے پر تیار نہ ہوئی تھیں اب اس کی دن دونی رات چوگنی ترقی دیکھ کر اپنی بیوقوفی پر افسوس کرنے لگیں۔ کئی عورتوں نے تو جھٹ زمینیں خرید ان بیسواؤں کے ساتھ ساتھ اسی وضع قطع کے مکان بنوانے شروع کر دیئے۔ علاوہ ازیں شہر کے بعض مہاجنوں نے بھی اس بستی کے آس پاس سستے داموں زمینیں خرید خرید کر کرایہ پر اٹھانے کے لئے چھوٹے چھوٹے کئی مکان بنوا ڈالے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ فاحشہ عورتیں جو ہوٹلوں اور شریف محلوں میں روپوش تھیں مور و ملخ کی طرح اپنے نہاں خانوں سے باہر نکل آئیں اور ان مکانوں میں آباد ہو گئیں۔ بعض چھوٹے چھوٹے مکانوں میں اس بستی کے وہ دکاندار آ بسے جو عیالدار تھے اور رات کو دکانوں میں سو نہ سکتے تھے۔

اس بستی میں آبادی تو کافی ہو گئی تھی مگر ابھی تک بجلی کی روشنی کا انتظام نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ ان بیسواؤں اور بستی کے تمام رہنے والوں کی طرف سے سرکار کے پاس بجلی کے لیے درخواست بھیجی گئی جو تھوڑے دنوں بعد منظور کر لی گئی اس کے ساتھ ہی ایک ڈاک خانہ بھی کھول دیا گیا۔ ایک بڑے میاں ڈاک خانہ کے باہر ایک صندوقچے میں لفافے' کارڈ اور قلم دوات رکھ' بستی کے لوگوں کے خط پتر لکھنے لگے۔

ایک دفعہ بستی میں شرابیوں کی دو ٹولیوں میں فساد ہو گیا۔ جس میں سوڈا واٹر کی بوتلوں' چاقوؤں اور اینٹوں کا آزادانہ استعمال کیا گیا اور کئی لوگ سخت مجروح ہوئے۔ اس پر سرکار کو خیال آیا کہ اس بستی میں ایک تھانہ بھی کھول دینا چاہیے۔

تھیٹریکل کمپنی دو مہینے تک رہی اور اپنی بساط کے مطابق خاصا کما کر لے گئی۔ اس شہر کے ایک سینما کے مالک نے سوچا کہ کیوں نہ اس بستی میں بھی ایک سینما کھول دیا جائے۔ یہ خیال آنے کی دیر تھی کہ اس نے جھٹ ایک موقع کی جگہ چن کر خرید لی اور جلد جلد تعمیر کا کام شروع کرا دیا۔ چند ہی مہینوں میں سینما ہال تیار ہو گیا۔ اس کے اندر ایک چھوٹا سا باغیچہ بھی لگوایا گیا تا کہ تماشائی اگر بائیسکوپ

شروع ہونے سے پہلے آ جائیں تو آرام سے باغیچہ میں بیٹھ سکیں۔ ان کے ساتھ بستی کے لوگ یونہی ستانے یا سیر دیکھنے کی غرض سے آ کر بیٹھنے لگے۔ یہ باغیچہ خاصی سیرگاہ بن گیا۔ رفتہ رفتہ سقے کٹورا بجاتے اس باغیچے میں آنے اور پیاسوں کی پیاس بجھانے لگے۔ سر کی تیل کی مالش والے نہایت گھٹیا قسم کے تیز خوشبو والے تیل کی شیشیاں واسکٹ کی جیبوں میں ٹھونسے کاندھے پر میل کچیلا تولیہ ڈالے دل پسند دل بہار مالش کی صدا لگاتے دردِ سر کے مریضوں کو اپنی خدمات پیش کرنے لگے۔

سینما کے مالک نے سینما ہال کی عمارت کی بیرونی جانب دو ایک مکان اور کئی دکانیں بھی بنوائیں۔ مکان میں ہوٹل کھل گیا جس میں رات کو قیام کرنے کے لیے کمرے بھی مل سکتے تھے اور دکانوں میں ایک سوڈا واٹر کی فیکٹری والا' ایک فوٹو گرافر' ایک سائیکل کی مرمت والا' ایک لانڈری والا' دو پنواڑی' ایک بوٹ شاپ والا اور ایک ڈاکٹر مع اپنے دوا خانہ کے آ رہے۔ ہوتے ہوتے پاس ہی ایک دکان میں کلال خانہ کھلنے کی اجازت مل گئی۔ فوٹو گرافر کی دکان کے باہر ایک کونے میں ایک گھڑی ساز نے آ ڈیرہ جمایا اور ہر وقت محدب شیشہ آنکھ پر چڑھائے گھڑیوں کے کل پرزوں میں غلطاں و پیچاں رہنے لگا۔

اس کے کچھ ہی دن بعد بستی میں نل' روشنی اور صفائی کے باقاعدہ انتظام کی طرف توجہ کی جانے لگی۔ سرکاری کارندے سرخ جھنڈیاں' جریبیں اور اونچ نیچ دیکھنے والے آلے لے کر آ پہنچے اور ناپ ناپ کر سڑکوں اور گلی کوچوں کی داغ بیل ڈالنے لگے اور بستی کی کچی سڑکوں پر سڑک کوٹنے والا انجن چلنے لگا۔

اس واقعہ کو بیس برس گزر چکے ہیں۔ یہ بستی اب ایک بھرا پرا شہر بن گئی ہے۔ جس کا اپنا ریلوے اسٹیشن بھی اور ٹاؤن ہال بھی۔ کچہری بھی اور جیل خانہ بھی۔ آبادی ڈھائی لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ شہر میں ایک کالج' دو ہائی سکول' ایک لڑکوں کے لیے ایک لڑکیوں کے لیے اور آٹھ پرائمری سکول ہیں جن میں میونسپلٹی کی طرف سے مفت تعلیم دی جاتی ہے۔ چھ سینما ہیں اور چار بنک جن میں سے دو دنیا کے بڑے بڑے بنکوں کی شاخیں ہیں۔

شہر سے دو روزانہ تین ہفتہ وار اور دس ماہانہ رسائل و جرائد شائع ہوتے ہیں۔ ان میں چار ادبی' دو اخلاقی و معاشرتی و مذہبی' ایک صنعتی' ایک طبی' ایک زنانہ اور ایک بچوں کا رسالہ ہے۔ شہر کے مختلف حصوں میں بیس مسجدیں' پندرہ مندر اور دھرم سالے' چھ یتیم خانے' پانچ اناتھ اشرم اور تین بڑے سرکاری ہسپتال ہیں جن میں سے ایک عورتوں کے لیے مخصوص ہے۔

شروع شروع میں کئی سال تک یہ شہر اپنے رہنے والوں کی مناسبت سے "حسن آباد" (Husn Abad) کے نام سے موسوم کیا جاتا رہا۔ مگر بعد میں اسے نامناسب سمجھ کر اس میں تھوڑی سی ترمیم کر دی گئی۔ یعنی بجائے "حسن آباد" (Husn Abad) کے

''حسن آباد''(Hasan Abad) کہلانے لگا۔ مگر یہ نام چل نہ سکا۔ عوام اور حسن اور حسن میں کچھ امتیاز نہ کرتے آخر بڑی بڑی بوسیدہ کتابوں کی ورق گردانی اور پرانے نوشتوں کی چھان بین کے بعد اس کا اصلی نام دریافت کیا گیا جس سے یہ بستی آج سے سینکڑوں برس قبل اجڑنے سے پہلے موسوم تھی اور وہ نام ہے ''آنندی''

یوں تو سارا شہر بھرا پرا صاف ستھرا اور خوشنما ہے مگر سب سے خوبصورت سب سے بارونق اور تجارت کا سب سے بڑا مرکز وہی بازار ہے جس میں زنان بازاری رہتی ہے۔

آنندی بلدیہ کا اجلاس زوروں پر ہے' ہال کھچا کھچ بھرا ہوا ہے اور خلاف معمول ایک ممبر بھی غیر حاضر نہیں۔ بلدیہ کے زیر بحث مسئلہ یہ ہے کہ زنان بازاری کو شہر بدر کر دیا جائے کیونکہ ان کا وجود انسانیت' شرافت اور تہذیب کے دامن پر بدنما داغ ہے۔

ایک فصیح مقرر تقریر کر رہے ہیں۔ ''معلوم نہیں وہ کیا مصلحت تھی جس کے زیر اثر ناپاک طبقے کو ہمارے اس قدیمی اور تاریخی شہر کے عین بیچوں بیچ رہنے کی اجازت دی گئی۔''

اس مرتبہ ان عورتوں کے لیے جو علاقہ منتخب کیا گیا وہ شہر سے بارہ کوس دور تھا۔



بھنور

اللہ کے کچھ بندے ایسے بھی ہیں جن کے لیے صوم وصلوٰۃ کا پابند ہونا کافی نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنے مذہبی ولولے کی تسکین کے لیے اس سے کہیں سوا چاہتے ہیں۔ ان کی تمنا ہوتی ہے کہ جس نور سے ان کا سینہ روشن ہے اس کی کرن دوسروں تک بھی پہنچے۔ وہ گمراہوں کی ہدایت کے لئے خطرناک جگہوں پر بھی جانے سے نہیں گھبراتے۔ انہیں نہ جان کا خوف ہوتا ہے نہ جگ ہنسائی کا۔ بلکہ وہ اس کام کو فریضہ سمجھ کر ادا کرتے ہیں۔

حاجی شفاعت احمد خان ایسے ہی دینداروں میں سے تھے' پچاس کے لگ بھگ سن' بھاری بھر کم جسم مگر خوب گٹھا ہوا معلوم ہوتا تھا کہ جوانی میں بھی کبھی کسرت سے شوق رہا ہوگا۔ سرخ وسفید رنگ' چوڑا چہرہ' کھچڑی داڑھی' مگر خوب بھری ہوئی۔ آنکھیں بڑی بڑی شربت رنگ کی جن میں ہر وقت سرخی جھلکتی رہتی۔ چہرے پر ایک جلالی کیفیت۔ لباس ان کا عموماً یہ ہوتا۔ خاکی رنگ کی شلوار' خاکی رنگ کی قمیض' چارخانے کپڑے کا کوٹ' پاؤں میں نری کا جوتا جو ہمیشہ گرد سے اٹا رہتا۔ سر پر سفید صافہ کلاہ پر بندھا ہوا۔ ہاتھ میں موٹے بید کی چھڑی۔ غرض لباس اور شکل وصورت سے وہ اچھے خاصے مرد مجاہد معلوم ہوتے تھے۔

حاجی صاحب صبح کو شہر کے ایک سرے سے جو گشت شروع کرتے تو شام ہوتے ہوتے پورے شہر کو جیسے کھنگال ڈالتے ان کے جاننے والوں کا کوئی شمار نہ تھا۔ قدم قدم پر علیک سلیک ہوتی رہتی۔ کبھی پاؤ پاؤ گھنٹے سڑک کے کنارے ہی تلقین وہدایت کا سلسلہ جاری رہتا۔ کبھی کوئی جان پہچان والا کسی ضرورت سے ساتھ لے جاتا مگر گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد وہ پھر گشت میں مصروف دکھائی دینے لگتے۔

وہ اپنی دینداری اور بزرگی کی وجہ سے بڑے ہر دلعزیز تھے یہاں تک کہ شہر کے حکام بھی ان کی عزت کرتے تھے۔ کبھی محلے کا کوئی آوارہ مزاج لڑکا جوا کھیلنے یا کسی اور فعل شنیعہ کے الزام میں پکڑا جاتا تو اس کا باپ حاجی صاحب ہی کی پناہ لیتا۔

''حضور! اس نالائق کے ہاتھوں سخت عاجز آ گیا ہوں' میں نے تو کبھی کا عاق کر دیا ہوتا مگر اس کی بدنصیب ماں کچھ کرنے نہیں دیتی۔ جب سے سنا ہے کہ حوالات میں بند ہے سر پیٹ پیٹ کر برا حال کر لیا ہے۔''

اور حاجی صاحب کی سفارش پر تھانے دار معمولی سی تنبیہ کے بعد لڑکے کو رہا کر دیتا۔

ان کے رسوخ کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کسی زمانے میں وہ خود بھی شہر کے اہلکاروں میں سے تھے۔ شروع ہی سے وہ نیک دل اور منکسر المزاج واقع ہوئے تھے۔ سادگی سے زندگی بسر کرتے تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے ہر مہینے تھوڑی تھوڑی رقم پس انداز کر کے ایک چھوٹا سا گھر بنا لیا تھا۔ جب انہیں نوکری کرتے بیس برس ہو گئے تو حج کا شوق ہوا۔ اس فریضہ سے فراغت پا کر ہنسی خوشی وطن لوٹے تھے کہ اچانک ایک المناک حادثہ ان پر گزرا۔ ان کا اکلوتا بیٹا جس کی عمر اٹھارہ برس کی تھی ہیضے کا شکار ہو کر چوبیس گھنٹے کے اندر اندر چل بسا اور پھر اس کے دو ہی دن بعد اس کی ماں بھی جسے بیٹے کی تیمارداری میں چھوت لگ گئی تھی۔ اس کے پاس پہنچ گئی۔ اس واقعہ کا ان کے دل پر ایسا گہرا اثر ہوا کہ انہوں نے علائق دنیوی سے منہ پھیر لیا اور باقی عمر ہدایت اور تبلیغ کے لئے وقف کر دی۔

اسی زمانے میں ان کے سر میں یہ دھن سمائی کہ رنڈیوں کی اصلاح کی جائے۔ بھلا قحبہ خانوں سے بڑھ کر معصیت کے اڈے اور کون ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ ان کا دستور تھا کہ ہر جمعرات کی شام وہ قرآن مجید سبز جزدان میں رکھ سینے سے لگا رنڈیوں کے بازار کا رخ کرتے اور انہیں گناہوں سے توبہ کرنے اور نیک راہ پر چلنے کی ہدایت کرتے۔ رفتہ رفتہ ان عورتوں کے گھروں میں ان کی آمد و رفت ایک معمول بن گئی۔ ان کی صورت دیکھتے ہی گانا بجانا بند کر دیا جاتا اور ان کے پند و نصائح کو خاموشی سے سنا جاتا۔ اس کے بعد گھر کی کوئی بڑی بوڑھی یا نائیکہ ایسے لہجہ میں جو ہوتا تو نرم مگر طعن سے خالی نہ ہوتا' کہتی۔

''حضرت اپنے شوق سے تو ہم یہ گناہ کرتے نہیں۔ یہ دوزخ جو لگا ہے' اس کو بھی تو بھرنا ہے۔ آپ ہماری گزر بسر کا انتظام کر دیجئے۔ ہم آج ہی اس پیشے کو چھوڑے دیتے ہیں مگر انتظام معقول ہونا چاہیے۔ ماما گیری تو ہم کرنے سے رہے۔''

اور یوں انہیں وقتی طور پر ٹال دیا جاتا۔

مگر کبھی کبھی ان گھروں میں حاجی صاحب کی تحقیر بھی خوب ہوتی اور انہیں گناہ اور بے حیائی کے ایسے ایسے منظر دیکھنے پڑتے کہ شرم سے نظریں جھکا لینی پڑتیں۔ ایک دفعہ ایک کوٹھے پر کسی ضیافت کا اہتمام تھا۔ بدقسمتی سے حاجی صاحب وہاں پہنچ گئے۔ ان کو دیکھنا تھا کہ ایک قحبہ نے جس کے منہ سے شراب کے نشے میں رال ٹپک رہی تھی' لپک کر ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور ان کی لمبی داڑھی کے پے در پے بوسے لینے شروع کر دیے۔ پھر وہ لڑکھڑائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''اے میرے مجازی خدا مجھے اپنے ساتھ لے چل۔ میں تیرے پاؤں دابوں گی' تیرے سر میں تیل ڈالوں گی۔ تیری داڑھی میں کنگھی کروں گی۔''

اور جتنی قحبائیں اور ان کے آشنا اس کوٹھے پر جمع تھے' یہ منظر دیکھ کر مارے ہنسی کے لوٹ لوٹ گئے۔

ایسے موقعوں پر وہ پیغمبروں اور ولیوں کے قصے یاد کرتے کہ کیسی کیسی ذلتیں اور ایذائیں انہیں راہ حق میں اٹھانی پڑیں اور اس

طرح اپنے دل کو تقویت دے کر وہ پہلے سے زیادہ مستعدی کے ساتھ تبلیغ کا کام جاری رکھتے۔

رفتہ رفتہ وہ اس محلے میں خاصے بدنام ہو گئے۔ بعض دفعہ آوارہ لڑکوں اور اوباش لفنگوں کی ٹولی ان کے پیچھے ہو لیتی۔ یہ لوگ بالا خانوں میں بیٹھی ہوئی بیسواؤں کی طرف ہاتھوں سے طرح طرح کے اشارے کرتے فحش آوازے کستے اور حاجی صاحب کو اپنا لیڈر بنا کر مضحک نعرے لگاتے۔ ان ہی باتوں سے اکثر لوگ حاجی صاحب کو مجذوب یا سودائی سمجھنے لگے تھے۔ وہ اس کی توضیح بھی کرتے کہ اکلوتے جوان بیٹے کی موت سے ان کے دماغ میں خلل آ گیا ہے۔

ایک دن حاجی صاحب کے پاس ایک شخص خبر لایا کہ بازار میں دو نئی رنڈیاں آئی ہیں۔ ایک کا نام گل ہے اور دوسری کا بہار۔ دونوں بہنیں ہیں۔ ایک ناچتی ہے۔ دوسری گاتی ہے۔ دونوں اپنے اپنے فن میں ماہر ہیں۔ حسن بھی دونوں کا قیامت کا ہے۔ چند ہی روز میں سارے شہر میں ان کا چرچا ہو گیا ہے۔ لوگ پروانوں کی طرح گر رہے ہیں۔ سنا ہے بنک کا ایک ملازم ان کو رام کرنے کے لئے بہت سا روپیہ اڑا لایا مگر پولیس موقع پر ان بیسواؤں کے گھر پہنچ گئی اور اس شخص کی گڈیوں سمیت پکڑ لیا گیا۔ ایک نوابزادے نے جو قلاش ہو گیا تھا اپنی محرومی پر ان کے مکانوں کی سیڑھیوں میں پستول سے خودکشی کر لی۔ غرض وہ وہ ہنگامے ہوئے کہ ایک مدت سے سننے میں نہیں آئے تھے۔ لوگ کہتے تھے کہ یہ دوسری زہرہ اور مشتری ہیں جن کے سحر حسن سے انسان تو کیا فرشتے بھی محفوظ نہیں۔

حاجی صاحب نے مصلحتاً کچھ دنوں سے اس بازار میں جانا چھوڑ رکھا تھا مگر اس نئے فتنہ کا حال سنا تو فوراً ان کے دل میں ایک نیا جوش پیدا ہوا۔ انہوں نے دل میں کہا کہ ان عورتوں کو جلد از جلد راہ راست پر لانا چاہیے ورنہ خدا معلوم یہ کتنے گھروں کو تباہ اور کتنے لوگوں کے ایمان کو غارت کر دیں گی۔

انہوں نے ظہر کی نماز پڑھی۔ قرآن شریف سینے لگایا اور پتہ پوچھتے پوچھتے گل اور بہار کے بالا خانے پر پہنچ گئے۔ وہ دونوں رات بھر جاگنے کے بعد صبح کو جو سوئی تھیں تو اب سہ پہر کے قریب جا کر بیدار ہوئی تھیں۔ اتفاق سے اس وقت ایک بوڑھی خادمہ کے سوا گھر میں اور کوئی نہ تھا۔ انہوں نے اپنے سامنے سرخ سرخ آنکھوں والے ایک مجذوب پٹھان کو جو دیکھا تو ڈر کے مارے ان کی گھگھی بندھ گئی۔

حاجی صاحب چند لمحوں تک حیرت سے ان کے حسن و جمال کو دیکھتے رہے پھر وہ پر شفقت لہجہ میں ان سے مخاطب ہوئے۔

''میری بیٹیو! مجھ سے ڈرو نہیں۔ میں کسی بری نیت سے نہیں آیا ہوں۔ میں تو تمہیں صرف یہ بتانے آیا ہوں کہ تمہاری عیش و عشرت کی یہ زندگی ایک دھوکہ ہے اور یہ دھوکہ صرف اسی وقت تک قائم ہے۔ جب تک تمہارے گالوں میں خون کی چند بوندیں ہیں۔ ان کی

تر و تازگی آخر کب تک رہے گی پانچ سال' سات سال' حد سے حد دس سال۔ اس کے بعد تم ایک قابل نفرت چیز بن جاؤ گی۔ اپنے عشاق کی نظروں ہی میں نہیں' اپنے عزیز ترین رشتہ داروں کی نظروں میں بھی۔ یہاں تک کہ تمہاری اولاد کو بھی تم سے گھن آئے گی۔ اس لیے کہ تمہارا وجود ان کے لیے انتہائی شرمندگی کا باعث ہوگا۔

میری بچیو! ذرا غور کرو۔ تمہاری زندگی کیسی ہنگاموں سے بھری ہوئی ہے۔ دن رات تمہارے چاہنے والوں کی دھینگا مشتی' قدم قدم پر جان کا خوف' ہر وقت پولیس کا دھڑکا' عدالت میں پیشیاں' یہ جینا بھی کوئی جینا ہے میری بیٹیو۔ تمہاری جگہ یہ بالا خانہ نہیں ہے۔ بلکہ کسی شریف گھر کی چار دیواری ہے جہاں تم ملکہ بن کر رہو جہاں تمہارا شوہر نگہبان اور محافظ ہو۔ تمہارے ناز اٹھائے اور تمہارے پسینے کی جگہ خون بہائے اور جہاں تمہاری اولاد کے لیے تمہارے قدموں کے نیچے جنت ہو۔"

یہ کہتے کہتے حاجی صاحب کی آواز رقت سے بھر آئی اور وہ اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکے۔

دونوں بہنوں پر سے خوف و ہراس تو دور ہو گیا تھا مگر ان باتوں کو سن کر وہ گم سم رہ گئی تھیں۔ آخر بڑی بہن گل نے کہا۔ "حضرت ہمارے ماں باپ نے ہمیں یہی پیشہ سکھایا ہے اس میں ہمارا کیا قصور؟"

حاجی صاحب نے اس دن ان سے کچھ اور کہنا مناسب نہیں سمجھا۔ انہوں نے ایک کاغذ کے پرزے پر اپنے گھر کا پتہ لکھ کر ان کو دیا اور یہ کہہ کر چلے آئے کہ مجھے اپنا باپ سمجھو اور جب بھی کوئی مشکل پڑے یا میری ضرورت ہو تو اس پتہ پر مجھے خبر کر دو۔

اس واقعہ کو آٹھ روز بھی نہیں گزرنے پائے تھے کہ ایک دن صبح ہی صبح ایک تانگہ ان کے مکان کے سامنے آ کر رکا۔ اس میں ایک عورت بیٹھی تھی جس نے سیاہ برقع اوڑھ رکھا تھا۔ تانگے میں دو ایک ٹرنک اور کچھ چھوٹی چھوٹی پٹیاں بھی تھیں۔ حاجی صاحب اس عورت کو اپنے مکان میں لے گئے اور اس کا سامان اندر پہنچا دیا گیا۔

یہ بہار تھی جو سچ مچ تائب ہو کر آ گئی تھی۔ اس کی خوبصورت آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کئی دن سے وہ روتی رہی ہے اور اب بھی اس کے آنسو تھمنے میں نہ آتے تھے۔

"جس دن سے آپ آئے تھے..." اس نے حاجی صاحب کو بتلایا۔ "اسی دن سے ہم دونوں بہنوں میں جھگڑا شروع ہو گیا تھا کیونکہ اب میں پل بھر کے لئے بھی بازار میں بیٹھنا نہیں چاہتی تھی۔ آخر آج صبح میں اس سے علیحدہ ہو گئی ہوں۔"

اپنی اس کامیابی پر جو بازاری عورتوں کے اصلاحی کام کے سلسلے میں ان کی پہلی فتح تھی' حاجی صاحب کو اس قدر خوشی ہوئی کہ شاید بیٹھے کے جی اٹھنے پر بھی نہ ہوتی۔ انہوں نے فوراً کپڑے بدلے اور سودا سلف لینے بازار چلے گئے۔ ان کے پیچھے بہار نے جھاڑو لے

کر سارے گھر کی صفائی کی۔ چولہا مدت سے راکھ سے بھرا تھا' اس کو صاف کیا۔ باورچی خانے کے فرش کو دھویا پونچھا اور اپنے سگھڑ پن سے ظاہر کر دیا کہ حسن و جمال' علم اور شستہ لب ولہجہ کے ساتھ ساتھ وہ امورِ خانہ داری سے بھی ناواقف نہیں۔

چند ہی دنوں میں بہار نے جس کا نام اب حاجی صاحب نے بدل کر بلقیس بیگم رکھ دیا تھا اپنی خدمت گزاریوں سے ان کو یقین دلا دیا کہ وہ سچے دل سے توبہ کر کے آئی ہے اور اگر کوئی شریف قدر دان مل گیا تو ساری زندگی اس کے ساتھ نباہ دے گی۔ حاجی صاحب کو اس سے سچ مچ ایسی الفت ہو گئی جیسی باپ کو بیٹی سے ہوتی ہے۔ ادھر بلقیس بھی ان کا دل سے احترام کرتی اور ان کے سامنے شریف گھرانوں کی لڑکیوں کی طرح ہمیشہ اپنی نظریں نیچی رکھتی۔ اب حاجی صاحب کو بلقیس کے لیے کسی اچھے رشتے کی فکر ہوئی۔ کیونکہ وہ یہ خوب سمجھتے کہ لڑکی کا اصلی گھر اس کے شوہر کا ہی ہوتا ہے۔

سرکاری ملازمت کے دوران میں حاجی صاحب کا ایک رفیق کار رحمت علی ہوا کرتا تھا۔ وہ حاجی صاحب کی بڑی عزت کرتا تھا۔ یہ بھی اس سے بھائیوں کی طرح پیش آتے تھے۔ وہ تو مدت ہوئی مر چکا تھا مگر اس کے لڑکے انور نے حال ہی میں انجینیری کا امتحان پاس کیا تھا اور اسے معقول سرکاری ملازمت مل گئی تھی۔ انور حاجی صاحب کو تایا ابا کہا کرتا اور اکثر ان سے ملنے آیا کرتا تھا۔ ابھی چند روز ہوئے کہ وہ اپنی اس کامیابی کی اطلاع دینے آیا تھا۔ ابھی تک اس نے شادی نہیں کی تھی۔ بلقیس کے رشتے کے سلسلے میں ان کا خیال فوراً اس کی طرف گیا۔ وہ اس کے دفتر پہنچے اور اس کو شام کے کھانے پر بلایا۔ ادھر گھر آ کر انھوں نے بلقیس سے کہا۔ ''بیٹی! آج شام ایک مہمان آ رہا ہے۔ وہ میرے ایک نہایت عزیز دوست کی نشانی ہے۔ تم یہ میلے کپڑے اتار کر کوئی اچھا سا لباس پہن لینا وہ میرے بیٹوں کی طرح ہے' اس سے پردہ نہیں کرنا ہو گا۔''

شام کو انور کھانے پر آیا تو بلقیس کے حسن اس کی شائستگی اور حیا کو دیکھ کر مبہوت رہ گیا۔ حاجی صاحب نے اس کو بلقیس کی بپتا سنائی اور اس سے کوئی بات چھپا نہ رکھی۔ دوسرے دن وہ پھر آیا۔ پھر تیسرے دن۔ پھر دن میں دو دو مرتبہ آنے لگا اور آخر مہینہ بھی نہ گزرنے پایا تھا کہ ان دونوں کی شادی ہو گئی۔

انور اور بلقیس کی خوب گزر ہونے لگی۔ وہ دونوں اکثر حاجی صاحب سے ملنے آیا کرتے۔ انور اپنی بیوی کو فریفتگی کی حد تک چاہتا تھا۔ ادھر بلقیس بھی دل وجان سے اس پر فدا تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ حاجی صاحب سے بھی ایسی الفت کرنے لگی تھی گویا وہ سچ مچ اس کے باپ ہیں اور پھر یہی تو تھے جن کی طفیل وہ گمراہی کے گڑھے سے نکلی تھی۔

جب ایک سال گزر گیا تو انور کی تبدیلی کسی اور شہر ہو گئی۔ حاجی صاحب ان میاں بیوی کو اسٹیشن پر رخصت کرنے آئے تو جدائی

کے خیال سے روتے روتے بلقیس کی ہچکی بندھ گئی۔حاجی صاحب نے بڑی تسلیاں دے کر اسے رخصت کیا۔

وہ باقاعدگی سے حاجی صاحب کو خط لکھتی جس میں اس کی اور انور کی خیریت اور گھر کے حالات تفصیل سے لکھے ہوتے۔اس کے ان خطوں میں ایک بلبل کی سی چہچہاہٹ تھی۔ان خطوں کا سلسلہ کوئی دو برس تک جاری رہا۔اس کے بعد جو خطوط آئے ان کا لہجہ اچانک سنجیدہ ہوگیا۔حاجی صاحب نے اس تبدیلی کو بلقیس کی بڑھتی ہوئی عمر کے تقاضے پر محمول کیا۔آخر تیسرے سال ایک خط آیا جسے پڑھ کر وہ بھونچکا رہ گئے۔لکھا تھا:

''ابا جان!تسلیم۔مجھے افسوس ہے کہ یہ خط پڑھ کر آپ کو صدمہ پہنچے گا۔میں نے عرصے تک اس معاملے کو آپ سے چھپائے رکھا۔تاکہ آپ کو دکھ نہ ہو لیکن اب بات اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ اس کا چھپانا ممکن نہیں اور میں سمجھتی ہوں کہ اس میں میرے شوہر انور کا کچھ قصور نہیں۔اس کی تمام ذمہ داری اس کے رشتہ داروں پر ہے جو ہر روز آ آ کر ان کے کان بھرتے رہتے ہیں۔ان لوگوں کو کسی نہ کسی طرح میری پچھلی زندگی کا حال معلوم ہوگیا ہے اور وہ مجھ سے نفرت کرنے لگے ہیں اور برملا طعنے دیتے ہیں۔چونکہ بدقسمتی سے اس عرصے میں میرے کوئی اولاد بھی نہیں ہوئی جو شاید انور کو مجھ سے قریب تر کر دیتی۔اس لئے یہ لوگ اب اس کوشش میں ہیں کہ انور میاں سے مجھے طلاق دلوا دیں۔میں نے اس لڑکی کو بھی دیکھا ہے جس کو وہ ان کے پلے باندھنا چاہتے ہیں۔اچھی شریف لڑکی ہے بے چاری صورت شکل کی بھی بری نہیں۔اب میری آپ سے التجا ہے کہ اس سے پہلے کہ یہ لوگ مجھے دھکے دے کر نکال دیں آپ خود آئیں اور مجھے طلاق دلوا کر لے جائیں۔''

آپ کی پیاری بیٹی......بلقیس

اس خط کی عبارت نے حاجی صاحب کو سخت بے چین کر دیا۔وہ رات بھر بستر پر کروٹیں بدلتے رہتے۔صبح ہوئی تو وہ اسٹیشن پہنچے اور پہلی گاڑی سے اس شہر کو روانہ ہوگئے جہاں انور ملازم تھا۔رات بھر وہ غم اور غصے سے کھولتے رہے ان کا جی چاہتا کہ وہ جاتے ہی انور کا منہ نوچ لیں گے۔راستے بھر وہ آیات قرآنی پڑھ پڑھ کر اپنا غصہ ٹھنڈا کرتے رہے۔

مصالحت کا سوال ہی نہیں تھا کیونکہ جب دلوں میں فرق پڑ جائے تو زندگی کا لطف جاتا رہتا ہے۔اب ان کی کوشش یہ تھی کہ وہ انور سے حق مہر حاصل کریں اور وہ تمام زیورات اور کپڑے بھی جو انور نے اب تک بلقیس کو بنوا کر دیئے تھے۔

انور اور اس کے رشتہ داروں نے زیادہ مزاحمت نہ کی انور کو توقع نہ تھی کہ اس قدر جلد بلقیس سے اس کا پیچھا چھوٹ جائے گا اور اسے کس قدر رنج بھی ہوا کیونکہ ابھی تک اس کے دل میں بلقیس کی کچھ کچھ محبت باقی تھی۔مگر اب کیا ہوسکتا تھا۔حاجی صاحب بلقیس کو

ساتھ لے دو تانگوں میں اسباب لدوا اسی رات اسٹیشن پہنچے اور دوسرے دن گھر آ گئے۔

بلقیس اب پھر حاجی صاحب کے پاس رہنے لگی۔ حاجی صاحب کو اب پھر اس کے رشتے کی فکر ہوئی اور ابھی تین مہینے بھی نہ گزرے تھے کہ انہوں نے اس کے لئے ایک اور شوہر تلاش کر لیا۔ اب کے جو آدمی چنا گیا وہ انور کی طرح نہ تو کم عمر تھا نہ زیادہ تعلیم یافتہ اور نہ اس کا تعلق کسی اونچے گھرانے سے تھا۔ وہ میوے کا کاروبار کرتا تھا۔ آئے دن دساور سے میوے کی بھری ہوئی لاریاں اس کے یہاں آتی رہتی تھیں۔ شہر کے میوہ فروشوں میں اس کی بڑی ساکھ تھی۔

یہ میوہ فروش جس کا نام ربانی تھا' رنڈوا تھا اور کسی نیک بیوہ سے عقد کرنا چاہتا تھا۔ حاجی صاحب نے حق مہر کے طور پر پانچ ہزار روپیہ نقد اور ایک مکان بلقیس کے نام لکھوانے کی شرط پیش کی۔ جسے اس نے بلا حیل و حجت منظور کر لیا تھا۔ دراصل یہ میوہ فروش بہار کے پرانے مگر ناکام عشاق میں سے تھا جب بہار بازار سے غائب ہوئی تھی تو وہ سخت پریشان ہوا تھا۔ پھر کچھ دن بعد جب اس نے سنا کہ حاجی صاحب نے اسے کسی انجینئر سے بیاہ دیا ہے تو وہ ایک سرد آہ بھر کے رہ گیا تھا۔ اب جو اسے اس طلاق کا حال معلوم ہوا تو اس کے دل میں پھر بہار کی آرزو تازہ ہو گئی اور اس نے جلد ہی منت خوشامد سے حاجی صاحب کو اس رشتے پر آمادہ کر لیا۔ مگر حاجی صاحب نے جب تک پورا حق مہر وصول نہ کر لیا میوہ فروش کو بلقیس کی شکل نہ دیکھنے دی۔

بلقیس نے ایک اطاعت مند بیٹی کی طرح حاجی صاحب کے تجویز کئے ہوئے رشتے کو صبر شکر سے قبول کر لیا اور دونوں کی خاصی گزر ہونے لگی۔ یہاں تک کہ ایک سال ہنسی خوشی میں گزر گیا مگر یہ میوہ فروش قطعاً عیاش واقع ہوا تھا۔ شادی کے بعد کچھ عرصہ تو وہ اس سے بڑی عزت کے ساتھ پیش آتا رہا مگر جلد ہی اس کے رویے میں تبدیلی آ گئی اور وہ اس سے ایسا سلوک کرنے لگا گویا وہ اس کی داشتہ ہو۔ وہ مصر تھا کہ بلقیس رات رات بھر اس کے ساتھ جاگے اور شراب نوشی میں شریک ہو۔ پھر وہ اس کا بھی متمنی تھا کہ آئے دن دوستوں کی دعوتیں ہوں اور بلقیس ساقی گری کی خدمت انجام دے اور وہ دوستوں سے فخریہ یہ کہہ سکے۔ ''یہی تھا وہ لعل بے بہا جس کی ایک جھلک دیکھنے کو دنیا ترستی تھی اور اب میں تنہا اس کی قسمت کا مالک ہوں۔''

مگر بلقیس نے اس کی ان خواہشوں کو سختی کے ساتھ رد کر دیا تھا۔ وہ اس کے دوستوں کی ضیافتوں میں اور ان کی مے خواری سے تو تعرض نہ کرتی مگر خود کبھی ان کے سامنے نہ آتی۔

رفتہ رفتہ میوہ فروش کا دل گھر سے اچاٹ رہنے لگا اور یہ محفلیں اب اوروں کے یہاں منعقد ہونے لگیں۔ میاں بیوی کے تعلقات کشیدہ رہنے لگے۔ کئی مرتبہ گالی گلوچ تک نوبت پہنچ گئی آخر ایک دن میوہ فروش نے شراب کے نشے میں بلقیس کو اس قدر مارا پیٹا کہ وہ

کئی دن تک بستر سے نہ اٹھ سکی۔

حاجی صاحب کو میاں بیوی کی ناچاقی کا علم تھا۔مگر جب انہیں اس مار پیٹ کی خبر ہوئی تو ان کی آنکھوں کے آگے اندھیرا آ گیا۔ وہ اسی وقت میوہ فروش کے گھر پہنچے اور بلقیس کو اپنے ہمراہ لے آئے۔میوہ فروش نے معافی مانگی' منت سماجت کی۔مگر حاجی صاحب پر کچھ اثر نہ ہوا۔انہوں نے کہا۔''اگر تم نے فوراً طلاق نہ دی تو میں تمہارے خلاف چارہ جوئی کروں گا۔''

میوہ فروش حاجی صاحب کے اثر ورسوخ کو بخوبی جانتا تھا۔مقدمہ بازی سے خائف ہو کر ناچار طلاق دینے پر آمادہ ہو گیا۔اب کے بلقیس سال بھر تک حاجی صاحب کے گھر پر رہی جب کبھی حاجی صاحب اس کے رشتے کا سوال اٹھاتے تو وہ تنگ کر کہتی۔''ابا جان! آپ کو میری فکر کیوں رہتی ہے' میں آپ پر بھاری ہوں کیا؟''

مگر ایک دور اندیش باپ کی طرح حاجی صاحب نہیں چاہتے تھے کہ بلقیس زیادہ عرصے گھر میں بیٹھی رہے۔علاوہ ازیں اس کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ اپنے اصلاحی کام میں ناکام رہے۔ان کا منصوبہ ناقابل عمل ثابت ہوا۔مگر ایک مرتبہ فتح حاصل کر کے اب وہ کسی طرح اس شکست کے لئے تیار نہ تھے۔چنانچہ انہیں پھر اس کی شادی کی فکر دامن گیر ہوئی اور بلقیس کچھ تو حاجی صاحب کے اصرار سے اور کچھ اپنے مستقبل کے خیال سے تیسری مرتبہ پھر شادی پر رضامند ہو گئی۔

اب کے حاجی صاحب نے شوہر کے انتخاب میں انتہائی حزم واحتیاط سے کام لیا اور مہینوں اس کے مزاج اور چال چلن کے بارے میں تفتیش کرتے رہے۔

یہ ایک نوعمر شخص تھا جو کسی دفتر میں معمولی کلرک تھا۔حد درجہ کم سخن' بھولا بھالا' ناک نقشہ بھی اچھا تھا۔البتہ ہاتھ پاؤں کا ذرا دبلا تھا۔سارا دفتر اس کی سادگی مزاج اور اطاعت گزاری کا معترف تھا۔ایسے داماد کو پا کر حاجی صاحب پورے طور پر مطمئن ہو گئے ادھر بلقیس نے بھی خوشی خوشی اسے قبول کر لیا۔البتہ اس بات کی ذرا خلش تھی کہ وہ عمر میں اس سے پانچ سال بڑی تھی۔

اس دفعہ حاجی صاحب نے اونچے خاندان اور روپے پیسے کا لالچ نہیں کیا تھا۔بلکہ مصلحتاً غریب شوہر چنا تھا اور پھر روپے کی ضرورت بھی کیا تھی کیونکہ پچھلے مہروں کی رقمیں' گھر کا سامان' زیور کپڑا لتا پہلے ہی وافر تھا۔اس کلرک کا نام منیر تھا۔اس کے آگے پیچھے کوئی نہ تھا۔کم عمری ہی میں ماں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا۔کچھ دور کے رشتہ دار تھے' مگر وہ اس کے خرچ کا بوجھ اٹھانے کو تیار نہ تھے اور اس نے یتیم خانے میں پرورش پائی تھی۔

بلقیس اور منیر خوش حالی اور فارغ البالی سے زندگی بسر کرنے لگے۔رفتہ رفتہ محبت کے بندھنوں نے ایک دوسرے کو جکڑ لیا۔

بلقیس کو ایسا محسوس ہوا کہ جو خوشی انور سے علیحدگی کے بعد چھن گئی تھی وہ اسے پھر مل گئی ہے۔ ادھر منیر بھی آٹھوں پہر اسی کا دم بھرتا تھا۔ وہ ایسا صالح نوجوان تھا کہ کسی قسم کا نشہ یا بری لت اس کو نہ تھی۔ دفتر سے چھٹی ملتے ہی سیدھا گھر کا رخ کرتا اور پھر بیوی کی قربت میں ایسا کھو جاتا کہ دوسرے دن دفتر کے وقت ہی گھر سے نکلتا۔

دن پر دن گزرتے گئے' ہفتے' مہینے اور پھر سال۔ دونوں کی محبت بڑھتی ہی چلی گئی۔ اب حاجی صاحب بھی بہت ضعیف ہو گئے۔ تبلیغ اور ہدایت کا وہ پہلا سا جوش و خروش ان میں نہیں رہا تھا۔ گھر سے کم ہی باہر نکلتے۔ مگر ان کو اطمینان تھا کہ بال آخر ان کی محنت ٹھکانے لگ گئی۔

اسی طرح پانچ سال گزر گئے۔ اس دوران میں منیر کو نوکری کے سلسلے میں کئی جگہ تبدیل ہو کر جانا پڑا۔ مگر وہ جہاں کہیں بھی جاتے بلقیس حاجی صاحب کو اپنی خیر و عافیت کی اطلاع دیتی رہتی۔

ایک دن حاجی صاحب کو ایک خط ملا جسے پڑھ کر اچانک ایک مرتبہ پھر دنیا ان کی آنکھوں میں اندھیر ہو گئی۔ بات یہ تھی کہ منیر کی صحت پچھلے سال سے دھیرے دھیرے گرنی شروع ہو گئی تھی۔ منیر کا ہر وقت گھر میں پڑے رہنا' کھیل تفریح میں حصہ نہ لینا' اس کی تندرستی کے لئے ضرر رساں ثابت ہوا اسے ہلکا ہلکا بخار رہنے لگا تھا اور کبھی کبھی کھانسی بھی اٹھنے لگی تھی۔ ڈاکٹروں کی رائے تھی کہ یہ ابتدائی دق کے آثار ہیں اور انہوں نے مشورہ دیا تھا کہ دفتر سے طویل رخصت لے لی جائے اور اسے کسی صحت افزا پہاڑی مقام پر رکھا جائے۔ خط کی آخری سطور یہ تھیں:

لیکن میرے پیارے ابا جان! آپ اس خبر سے زیادہ پریشان نہ ہوں۔ ڈاکٹر نے کہا کہ منیر میاں سال بھر باقاعدہ علاج کرانے سے تندرست ہو جائیں گے۔ میں خود ان کی تیمارداری کروں گی اور جس صحت افزا مقام پر وہ رہیں گے میں ان کے ساتھ رہوں گی۔ شفا تو اللہ نے چاہا تو انہیں ضرور ہو جائے گی مگر اس میں تین چار سو روپیہ ماہوار اٹھے گا۔ سو اس کی آپ فکر نہ کریں۔ وہ جو میرے نام کا مکان ہے اسے فروخت کر دیں۔ آخر جائیداد اسی قسم کی ضرورتوں ہی کے لئے تو ہوتی ہے' جان ہے تو جہان ہے۔ امید ہے آپ ان تمام باتوں کا جواب مفصل لکھیں گے یا خود تشریف لائیں گے۔

آپ کے دیدار کی طالب...... بلقیس

اس خط کو پڑھ کر حاجی صاحب گم سم رہ گئے۔ اچانک دل میں ایسا ضعف محسوس ہوا' گویا ان کا آخری وقت آن پہنچا ہو۔ دو دن تک وہ گھر سے باہر نہ نکلے۔ تیسرے دن جب ذرا طبیعت سنبھلی تو وہ لاٹھی ٹیکتے ہوئے اٹھے اور جائیداد کی فروخت کے سلسلے میں کسی

دلال کی تلاش میں نکلے۔ قدم گھر سے باہر رکھا ہی تھا کہ ایک تانگا ان کے دروازے کے سامنے آ کر رکا۔ اس میں ایک برقعہ پوش خاتون بیٹھی تھی۔ ساتھ کچھ سامان تھا۔ دو ٹین ٹرنک ایک اٹیچی کیس۔

حاجی صاحب ٹھہر گئے۔ ان کی صورت دیکھ کر اس خاتون نے چہرے سے نقاب اٹھا دی۔ اس کا سن تیس پینتیس برس سے کسی طرح کم نہ ہوگا۔ مگر اس کے حسن میں ابھی تک غضب کی شادابی تھی۔

''میں بہار کی بہن گل ہوں۔'' اس نے بڑی لجاجت سے کہنا شروع کیا۔ ''دس سال ہوئے جیسے حضور نے میری بہن کو دین اور آخرت کی راہ دکھائی تھی ویسے ہی مجھ پر بھی کرم کی نظر ہو جائے۔''



اس کی بیوی

وہ دونوں تیسری منزل کے ایک کمرے میں تھے۔ یہ چھوٹا سا کمرہ اپنی ہلکی نیلی روشنی کے ساتھ باہر سے یوں دکھائی دیتا' گویا ٹرین کا کوئی ڈبہ ہے جس طرح ریلوے والے گرمی کے موسم میں ''فردوس بکمیں'' یا ''خواب یاسمیں'' وغیرہ شاعرانہ نام رکھ کر بعض خاص گاڑیوں میں جوڑ دیتے ہیں۔

بارشوں کا زمانہ قریب قریب ختم ہو چکا تھا۔ مکانوں میں بسنے والی مخلوق نے پسینے' بدبو اور گھٹن سے نجات پائی تھی۔ فضا میں خصوصاً رات کے وقت خنکی ہونے لگی تھی۔ ہاں جب کوئی بڑا سا کالے رنگ کا پتنگا اپنی تیز بھنبھناہٹ کے ساتھ اندھا دھند کسی برقی قمقمے کے چکر کاٹنے لگتا تو ظاہر ہو جاتا کہ برکھا رت ابھی گئی نہیں۔

''نجمہ بھی ٹھیک اسی طرح سیدھی مانگ نکالا کرتی۔'' نوجوان نے کہا۔ ''مگر کبھی کبھی وہ گدی تک مانگ لے جاتی۔ یہ طریقہ اس نے ایک بنگالن سے سیکھا تھا۔''

نسرین چپ رہی۔ نظریں فرشی سنگھار میز کے آئینے پر جمائے جس میں اسے اپنا دھندلا دھندلا نیلگوں عکس دکھائی دے رہا تھا وہ بالوں میں کنگھی کرتی رہی جیسا کہ سونے سے پہلے بعض عورتوں کی عادت ہوتی ہے۔

نوجوان اس کے پاس ہی چاندنی پر کہنیوں کے بل اوندھا لیٹا ہوا تھا۔ یوں لیٹنے سے اس کی سفید سلک کی قمیض اور خاکی زین کی پتلون میں جا بجا سلوٹیں پڑ گئی تھیں۔ اس نے چند لمحے جواب کا انتظار کیا۔ اور پھر کہنا شروع کیا۔ ''کبھی کبھی نجمی اپنے داہنے کان کے پاس سے اپنے بھورے بالوں کی ایک لٹ نکال کر لام (ل) سا بنا لیا کرتی جو اس کے سرخ و سفید بھرے بھرے گال پر بہت بھلا لگتا۔''

نسرین کے چہرے پر خفیف سی اضمحلال کی کیفیت پیدا ہوئی۔ مگر زبان سے اب بھی اس نے کچھ نہ کہا۔ وہ سوچ رہی تھی یہ کیسا مرد ہے۔ جس کے پاس بات کرنے کو بیوی کے سوا اور کوئی موضوع ہی نہیں۔ وہ دو گھنٹے سے برابر اسی عورت کا ذکر سنے جا رہی تھی جو اب دنیا میں موجود نہ تھی۔ ان دو گھنٹوں میں اس نوجوان کی متاہل زندگی کے تمام اہم واقعات اور اس کی مرحوم بیوی کی بہت سی عادتوں اور خصلتوں سے واقف ہو چکی تھی۔ یہ کہ اسے بچپن ہی سے اپنی بیوی سے عشق تھا۔ یہ کہ نجمہ کا باپ ان کی شادی کے خلاف تھا مگر ماموں

اور چچا حق میں تھے۔ یہ کہ نجمہ لمبے قد کی تھی۔ اسے گانا سیکھنے کا بہت شوق تھا۔ جب وہ ہنستی تو اس کے بائیں گال میں گڑھا پڑ جاتا۔ اسے حنا کا عطر بہت مرغوب تھا۔ وہ کروشئے سے مور بہت اچھا بنایا کرتی۔

شروع شروع میں نسرین کو اس ذکر سے کچھ یوں ہی دلچسپی ہوئی تھی جیسا کہ ابتدا میں عموماً ایک عورت کو دوسری عورت کے ذکر سے ہوا کرتی ہے مگر جلد ہی وہ اس سے بیزار ہوگئی تھی اور آخر جب اس کی جمائیاں اور انگڑائیاں بھی اس موضوع سے اس کا پیچھا نہ چھڑا سکیں تو زچ ہو کر اس نے چپ سادھ لی تھی۔

وہ اب چوٹی کر کے جوڑا باندھ چکی تھی اور ان ہیر پنوں اور کلپوں کو جن سے وہ اپنے بالوں کی آرائش میں مدد لیا کرتی' فرش سے اٹھا اٹھا کر سنگھار میز کے خانے میں ڈال رہی تھی۔ اسی اثنا میں نوجوان کی نظریں اس کی گوری گوری انگلیوں کی خفیف ترین حرکات کا بھی تعاقب کر رہی تھیں۔

دو منٹ خاموشی میں گزر گئے۔

کئی دن ہوئے اس نوجوان نے نسرین کو دیکھا تھا اسے دیکھتے ہی اسے اپنی مرحوم بیوی کی یاد بے طرح ستانے لگی تھی اور وہ اس سے ملنے کی تدبیریں کرنے لگا تھا اور جب اس نے اس قدر روپیہ جمع کر لیا کہ دو راتوں کے لئے اس عورت کو خرید سکے تو اس نے سیدھا اس کے گھر کا رخ کیا۔

''میری بیوی......''

''تو گویا بہت محبت تھی آپ کو بیگم صاحبہ سے!'' بالآخر نسرین نے بات کاٹ کر کہا۔ جب ایک آدمی بولے ہی چلا جائے تو دوسرا کب چپ رہ سکتا ہے۔

''بے حد'' بے ساختہ نوجوان کے منہ سے نکلا۔ وہ اس کے طعن کو نہیں سمجھ سکا تھا۔

''مگر صاحب آپ کی باتیں بھی عجیب ہیں۔'' ایک انتقامی جذبہ اس میں بیدار ہو رہا تھا۔ ''سمجھ میں نہیں آتا وہ کیسی محبت تھی جس اس کے مرنے کے تین مہینے بعد رفو چکر ہوگئی اور اب......''

وہ فقرہ مکمل نہ کر سکی۔ شاید اسکی ضرورت بھی نہ تھی کیونکہ نوجوان اس کا مطلب بخوبی سمجھ گیا تھا۔ وہ کچھ دیر گم سم رہا۔ پھر اس نے اپنی صاف اور روشن آنکھیں اٹھا کر' جن میں مجرمانہ گھبراہٹ یا گنہگارانہ ندامت کی کوئی علامت نہ تھی' نسرین کے چہرے کی طرف دیکھا۔ پھر وہ آلتی پالتی مار کے بیٹھ گیا کہ شاید لیٹے رہنے سے وہ اپنی مدافعت پورے طور پر نہ کر سکے۔ اس کے ہونٹ پل بھر کو

لرزے۔ مگر زبان کچھ نہ کہہ سکی۔

چند لمحوں تک دونوں خاموش بیٹھے رہے اس کے بعد نسرین انگڑائی لیتی ہوئی بغیر کچھ کہے کمرے سے نکل گئی۔

کوئی پاؤ گھنٹے بعد وہ واپس آئی۔ زیور وغیرہ اس نے اتار دیئے تھے اور شب خوابی کے لئے ایک سادہ سی اجلی دھوتی باندھ لی تھی۔ وہ اس قدر آہستہ سے داخل ہوئی کہ نوجوان نے اس کے قدموں کی چاپ تک نہیں سنی۔ وہ چاندنی پر پیٹ کے بل لیٹا ہوا تھا۔ اس کی عمر چوبیس پچیس برس سے کم نہ ہوگی۔ مگر اس وقت برقی لیمپ کی مدھم نیلی روشنی میں وہ اپنی چھوٹی چھوٹی سیاہ مونچھوں' گھنے ابروؤں اور چمکتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ کالج کی کسی ابتدائی جماعت کا طالب علم معلوم ہوتا تھا۔ اس کے سامنے چاندنی پر مٹر کے دانے کے برابر ایک سیاہ پتنگا چت پڑا تھا۔ جو شاید برقی قمقمے سے ٹکرا کر نیچے آ رہا تھا۔ پتنگا اپنی ننھی ننھی بال سی ٹانگیں ہوا میں ہلا ہلا کر اور سر کو فرش پر رگڑ رگڑ کر سیدھا ہونے کی کوشش کرتا' مگر جہاں اسے ذرا کامیابی ہوتی نوجوان ایک بجھی ہوئی دیا سلائی کے سرے سے پھر اسے اوندھا کر دیتا۔

جب نسرین بالکل اس کے سر پر آ کھڑی ہوئی تو وہ چونک پڑا۔

''اوہ آپ ہیں'' اور اس نے کچھ شرمندہ سا ہو کر پتنگے کو دیا سلائی سے پرے اچھال دیا۔

''بیگم صاحب کے مرنے کا رنج تو بہت ہوا ہوگا آپ کو؟'' یہ سوال کر کے وہ خود حیران رہ گئی۔

نوجوان نے لمحہ بھر تامل کیا اور پھر سنجیدہ لہجہ میں کہنا شروع کیا۔

''نہیں' شروع شروع میں کچھ ایسا غم نہیں ہوا تھا۔ یقین ہی نہیں آتا تھا کہ ایسا ہو گیا ہے۔ مگر میں زیادہ دن اس فریب میں نہ رہ سکا۔ میں بیمار پڑ گیا۔ مہینہ بھر چارپائی پر پڑا رہا۔ جب میری حالت بہت خراب ہو جاتی تو امی جان اور زہری' یہ میری چھوٹی بہن کا نام ہے' میرے سرہانے آ کھڑی ہو جاتی اور ایسی چپ چپ سہمی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھتیں کہ میں جلدی سے آنکھیں بند کر لیتا اور چاہتا کہ نہ مروں۔ بس پھر میں رفتہ رفتہ تندرست ہوتا گیا۔''

اس کے لہجے نے نسرین کو متاثر کیا۔

دو تین لمحے پھر دونوں چپ رہے۔

''آپ نے کہا تھا۔'' اچانک نسرین کے لہجے میں شوخی جھلکنے لگی۔ ''میری شکل بیگم صاحب ملتی جلتی ہے۔ بھلا کیا چیز ملتی ہے؟''

نوجوان نے پل بھر غور کیا۔

''سب سے زیادہ تمہاری آنکھیں مجھ سے ملتی ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔ مگر لہجے میں ابھی افسردگی کا اثر دور نہیں ہوا تھا۔ ''ویسی ہی سیاہ اور گہری۔ دوسرے نمبر پر ٹھوڑی ویسی ہی پتلی اور تیسرے نمبر پر......''

''چلئے بٹے بنائیے نہیں''

''تمہارے بال' تمہاری گردن...''

نوجوان کی فطری چونچالی تیزی سے بحال ہو رہی تھی اور نسرین خود کو روکے ہوئے تھی کہ اس سلسلہ میں کوئی اور سوال نہ کر بیٹھے۔

آدھ گھنٹے بعد روشنی گل کر دی گئی اور وہ دونوں کھڑکی کے پاس پلنگ پر دراز ہو گئے تھے۔ نوجوان جو رات کو جلد ہی سو جانے کا عادی تھا زیادہ دیر تک نہ جاگا مگر نسرین آنکھیں کھولے دیر تک کھڑکی میں سے آسمان کو دیکھتی رہی۔

یہ قمری مہینے کی آخری تاریخوں کی ایک رات تھی۔ آسمان صاف مگر تاریک تاریک سا تھا۔ ستارے اس قدر تیزی سے چمک رہے تھے کہ معلوم ہوتا تھا زمین کے قریب سرک آئے ہیں۔ نسرین ستاروں کو ہمیشہ دلچسپی سے دیکھا کرتی تھی۔ سب سے پہلے وہ ستاروں سے آشنا ہوئی تھی۔ اس کی عمر چار برس کی تھی۔ ماں مر چکی تھی مگر باپ زندہ تھا۔ اس نے باپ کے ساتھ ریل گاڑی میں ایک لمبا سفر کیا تھا۔ آدھی رات کو وہ دونوں ایک چھوٹے سے دیہاتی اسٹیشن پر اترے تھے۔ اسی اسٹیشن پر لالٹین کی مدھم روشنی میں ایک موٹے ننگ دھڑنگ فقیر نے اسے ایسی لال لال ڈراؤنی آنکھوں سے گھورا تھا کہ اس کی چیخ نکل گئی تھی اور وہ بے اختیار باپ کی ٹانگوں سے لپٹ گئی تھ۔ کچھ دیر دونوں اسٹیشن ہی پر ٹھہرے رہے مگر کوئی سواری نہ ملی۔ آخر باپ نے اسے گود میں لے لیا۔ گٹھڑی بغل میں ماری اور اندھیرے گھپ میں پیدل چلنا شروع کر دیا۔

یہ سفر بھی بہت لمبا تھا۔ مگر اس کی سہمی ہوئی نظروں سے جلد ہی ستاروں کو ڈھونڈ نکالا تھا۔ ان کو دیکھ کر اس کا ڈر کم ہونے لگا تھا۔ یہاں تک کہ وہ باپ کے کندھے سے لگ کر سو گئی۔ آنکھ کھلی تو خود کو ایک اجنبی عورت کے گھر پایا۔ وہ کئی دن تک روتی بلکتی رہی مگر باپ کی صورت دیکھنا اسے پھر کبھی نصیب نہ ہوا۔

صبح کو نسرین کی آنکھ کھلی تو سورج خاصا نکل آیا تھا۔ اٹھتے ہی سب سے پہلے اسے جو احساس ہوا' یہ تھا کہ نوجوان اس کے بستر پر موجود نہیں اس نے سوچا غسل خانے میں ہوگا اور وہ کھلے کھلے بستر پر کروٹیں بدلنے لگی۔

جب پاؤ گھنٹہ گزر گیا اور نوجوان کہیں نظر نہ آیا تو اسے الجھن ہونے لگی۔ شمن جھاڑو لئے کمرے میں آیا تو اس نے پوچھا۔ ''وہ رات والے بابو کہاں ہیں؟''

"چلے گئے۔"

"چلے گئے؟" اس نے تعجب سے پوچھا۔

"جی ہاں' صبح ہی صبح۔ ہم سب سو رہے تھے۔ دروازہ بھی تو کھلا ہی چھوڑ گئے۔"

"ویسے تو سب خیریت ہے نا؟" بے ساختہ اس کے منہ سے نکل گیا۔

"جی سب خیریت ہے۔" شمن اس کا مطلب فوراً سمجھ گیا تھا۔ "میں نے اٹھتے ہی سب دیکھ بھال لیا تھا۔"

اپنے شبے کے گھٹیا پن پر اسے شرم آ گئی۔ مگر دوسرے ہی لمحے اس خیال نے اس پر تسلط جما لیا کہ وہ نوجوان چلا کیوں گیا۔ اس نے سوچا' رات اسے میرا طعنہ برا لگا وہ بڑا احساس تھا۔ اوپر اوپر سے ہنستا بولتا رہا۔ صبح ہوتے ہی چل دیا۔

منہ ہاتھ دھو کر نیچے پھوپھی کے پاس جانے کو تھی کہ اچانک کسی کے جلد جلد سیڑھیاں چڑھنے کی آواز آئی' نوجوان گیا نہیں تھا۔ وہ رومال میں کچھ باندھے لئے آ رہا تھا۔

"معاف کرنا" اس نے اپنے پھولے ہوئے سانس پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "میں تمہیں بتائے بغیر ہی چلا گیا۔ میں نے جگانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔" "یہ لو" یہ کہہ کر اس نے رومال نسرین کے ہاتھ میں دے دیا۔

"کیا ہے؟" نسرین نے پوچھا۔

"گوشت ترکاری" یہ کہہ کر وہ مسکرانے لگا' جیسے اس نے کوئی شرارت کی ہو۔

"گوشت ترکاری! کس نے کہا تھا لانے کو؟"

"خفا کیوں ہوتی ہو؟ بات یوں ہے' جب نجمی زندہ تھی میں یونہی منہ اندھیرے اسے جگائے بغیر گھر سے نکل جاتا' ہوا خوری کی ہوا خوری ہو جاتی اور گھر کا سودا بھی لے آتا۔ ہمیں نوکر رکھنے کی توفیق نہیں تھی۔ بس یونہی مل بانٹ کر کام کیا کرتے۔ وہ گھر کا اور میں باہر کا۔ ذرا دیکھو تو گوشت کیا عمدہ اور تازہ ہے۔ آدھا دست کا اور آدھا پشت کا۔ اور گردا روئے میں۔ نوکر کا باپ بھی ایسا گوشت نہیں لا سکتا اور پھر ذرا کچنال تو دیکھو' آج ہی شہر میں آئی ہے۔ پھر پیاز بھی ہے' ہری مرچیں بھی اور ادرک بھی اور دھنیا بھی۔"

نوجوان داڑھی بھی منڈوا تا آیا تھا۔ تھوڑا سا صابن اس کے کانوں کی لوؤں پر ابھی تک لگا رہ گیا تھا۔ نسرین کا جی چاہا کہ دوپٹہ کے دامن سے صابن کو پونچھ دے مگر وہ ایسا نہ کر سکی۔

"آپ نے ناحق تکلیف کی۔" نسرین نے کہا۔ "خیر اب لے آئے تو میں شمن کو بلواتی ہوں۔"

''نہیں نہیں اسے مت بلواؤ۔''

''یہ کیوں؟''

''میں کھانا خود پکاؤں گا۔ جب نجمی زندہ تھی تو کبھی کبھی میں ہنڈیا پکایا کرتا وہ سامنے مونڈھے پر بیٹھی مجھے بتاتی رہتی۔''

''ہمارا ثمن بہت ہوشیار ہے۔'' نسرین نے کہا۔ ''ایسا کھانا پکاتا ہے کہ زبان چٹخارے لیتی رہ جاتی ہے۔''

''نہیں صاحب'' نوجوان نے قطعی فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔ ''نجمی کچنال ایک خاص ترکیب سے پکایا کرتی تھی وہ ترکیب تو وہ جانتی تھی یا میں جانتا ہوں۔ مہربانی کرکے آپ انگیٹھی' کوئلے اور چاقو منگوا دیجئے۔''

نسرین نے اس سلسلے میں کچھ اور کہنا مناسب نہ سمجھا اور خاموش سیڑھیوں سے اتر گئی۔

''آؤ بیٹا'' نسرین کی پھوپھی نے اسے دیکھ کر اگالدان میں پیک تھوکتے ہوئے کہا۔ ''میں ابھی ابھی ثمن سے کہہ رہی تھی کہ تمہارا اور اس کا ناشتہ اوپر لے جائے۔''

''میں ناشتہ نہیں کروں گی' اس کے لیے اوپر بھیج دو۔''

''تم چپ چپ کیوں ہو؟''

''نہیں تو......''

''شکل سے تو بڑا کم زبان معلوم ہوتا ہے۔''

نسرین نے کچھ جواب نہ دیا۔

''کیا کر رہا ہے اس وقت؟'' پھوپھی نے پوچھا۔

''ہنڈیا کا سودا خرید کر لایا ہے خود ہی پکانے بیٹھا ہے۔''

نسرین کی پھوپھی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''سچ؟''

''ہاں ہاں''

''بڑا ہی سیدھا سادہ ہے۔''

''مخبطی ہے پوری رات بھر اپنی مری ہوئی بیوی کی باتیں کرکے دماغ چاٹ گیا۔ ثمن کو اس کے پاس بھیج دینا۔ ہاتھ بٹاتا رہے گا۔

میں ذرا نو بہار کے ہاں جاتی ہوں۔"

نسرین کا خیال تھا کہ وہ کم سے کم ایک گھنٹہ نو بہار کے ہاں ضرور ٹھہرے گی مگر پاؤ گھنٹہ بھی نہ گزرنے پایا تھا کہ اٹھ آئی۔ سیدھی اوپر کی منزل میں پہنچی۔ دیکھا کہ کمرے کے باہر دالان میں انگیٹھی دہک رہی ہے اور نوجوان اس کے پاس ہی ایک چھوٹی سی دری پر آلتی پالتی مارے بیٹھا پیاز کتر رہا ہے۔ آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں۔ پانی بہہ رہا ہے۔ اس سے ذرا ہٹ کے شمن بیٹھا بڑے مزے سے یہ تماشا دیکھ رہا ہے۔

"شمن!" نسرین نے کسی قدر سختی سے کہا۔ "تم بیٹھے منہ کیا تک رہے ہو۔ صاحب سے پیاز لے کر کیوں نہیں کترتے؟"

"میں تو کئی دفعہ عرض کر چکا ہوں۔" شمن نے منہ بنا کر کہا۔ "پر صاحب مانتے ہی نہیں۔ مجھ سے آگ جلانے کو کہا۔ میں نے آگ جلا دی۔"

"اچھا تم نیچے جاؤ۔"

جب شمن چلا گیا' تو نسرین نے کہا۔ "حضرت یہ اس عمر میں ہنڈیا کلھیا پکانے کی کیا سوجھی ہے۔ لائیے پیاز مجھے دیجئے' اور جا کر آنکھوں پر چھینٹے دیجئے۔"

اور اس نے ہاتھ بڑھا کر نوجوان کی گود سے پیاز کی رکابی خود ہی اٹھالی' نوجوان نے مزاحمت نہ کی۔ دو گھنٹے کے بعد جب وہ دونوں دستر خوان پر کھانا کھانے بیٹھے تو نوجوان نے کہا۔ "معاف کرنا' میری وجہ سے تم کو اتنی تکلیف اٹھانی پڑی۔ بات یہ ہے کہ نجمی۔۔۔"

"باتیں چھوڑیے اور کھانا کھائیے۔"

"واہ کیا مزے کا کھانا پکایا ہے۔" نوجوان نے پہلا نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ "نجمی کے ہاتھ کا مزہ یاد آ گیا۔"

"چلیے زیادہ بنائیے نہیں۔ چپاتیاں تو دیکھئے' کیسی ٹیڑھی بینگی ہیں۔"

"چپاتیاں نجمی کو بھی پکانی نہیں آتی تھیں اور میں زیادہ تر تنور ہی سے روٹیاں لگوا کر لایا کرتا تھا۔"

"مجھے تنور کی روٹی زہر لگتی ہے۔"

"کبھی کبھی ہم کوئی سستا سا خانساماں بھی رکھ لیا کرتے' مگر وہ پندرہ بیس روز سے زیادہ نہ ٹکتا۔ چپکے چپکے کسی اچھے گھر کی ٹوہ میں رہتا اور پھر کھسک جاتا۔"

کھانے سے فارغ ہو کر دونوں کمرے میں فرش پر آ بیٹھے۔

''آپ نے کہا تھا۔'' نسرین نے کہا۔ ''آج کل آپ کسی دوست کے ہاں رہتے ہیں۔''

''ہاں' نجمی کے مرنے کے بعد میں نے امی جان اور زہری کو تو گاؤں بھیج دیا تھا اور خود ایک دوست کے ہاں اٹھ آیا تھا۔ یہ دوست بھی میری طرح اکیلا ہی تھا۔ ہم دونوں مکان کے کرائے' کھانے پینے کے خرچ اور نوکر کی تنخواہ میں ساجھی ہیں۔''

''اور آدھی تنخواہ آپ امی جان کو بھیج دیتے ہیں؟''

''ہاں' مگر وہ ہمیشہ کسی نہ کسی بہانے کچھ نہ کچھ لوٹاتی ہی رہتی ہیں۔ کبھی گرم پتلون سلوانے کے لیے کبھی نیا بوٹ خریدنے کے لئے۔''

نسرین نے محسوس کیا کہ اس کی ماں اسے بہت چاہتی ہوگی۔

''اپنی ہمشیرہ کی کیا عمر بتائی تھی آپ نے؟''

''دس برس' بڑی پیاری بچی ہے۔''

''سکول جاتی ہے؟''

''نہیں' گھر پر مولوی صاحب سے پڑھتی ہے۔ سینا پرونا اسے دادی سکھاتی ہے۔ اس نے ایک بکری پالی ہے۔ دودھ سے سفید' ایک بھی کالا بال نہیں۔ زہرہ اس کی بڑی دیکھ بھال کرتی ہے۔ کھیت سے بوٹنے توڑ لاتی ہے' اپنے ہاتھ سے کھلاتی ہے۔ ہمارے گاؤں کے پاس ہی چھوٹی سی ندی بہتی ہے۔ وہ اسے وہاں پانی پلانے لے جاتی ہے۔ ایک دن کیا ہوا کہ وہ بکری پانی پی رہی تھی کہ ایک بڑا سا کتا آیا وہ جو زور سے بھونکا تو بکری ڈر کر ندی میں گر پڑی۔ پانی کا بہاؤ تیز تھا۔ وہ اس کے ساتھ بہہ چلی۔ اس پر زہرہ نے چیخ چیخ کر برا حال کر لیا۔ اتفاق سے ایک کسان ادھر سے گزرا' شور سن کر دوڑا ہوا آیا۔ بڑی مشکل سے بکری کو نکالا تب زہرہ کی جان میں جان آئی۔''

نسرین یہ سادہ سا بے رنگ واقعہ بڑی دلچسپی سے سنتی رہی۔

اب نوجوان پر کچھ کچھ غنودگی طاری ہو رہی تھی۔ وہ گاؤ تکیہ کے سہارے لیٹ گیا۔ رفتہ رفتہ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور وہ سو گیا۔

نسرین اٹھی۔ الماری کے خانے سے سفید ململ کا دوپٹہ اور گوٹا اٹھا لائی اور نوجوان کے قریب ہی فرش پر بیٹھ دوپٹہ میں گوٹا ٹانکنے

لگی۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں اس کا جی اکتا گیا اور وہ بھی پلنگ پر جا کر لیٹ گئی۔

تیسرے پہر ایک رکشا منگوایا گیا اور وہ دونوں بازار جانے کی تیاری کرنے لگے۔ نوجوان نے خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ اسے کوئی تحفہ خرید کر دینا چاہتا ہے۔ اس نے بغیر کسی شرم وحجاب کے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ نسرین بیس روپے تک کی جو چیز چاہے خرید سکتی ہے اس سے زیادہ کی اسے توفیق نہیں۔

"یہ سچ ہے" اس نے کہا "کہ اتنے کم داموں کی کوئی چیز تمہارے لائق نہیں ہو سکتی۔ مگر میرا جی چاہتا ہے کہ میری کوئی چیز خواہ وہ کتنی ہی حقیر کیوں نہ ہو تمہارے پاس بطور یادگار رہے۔"

اور وہ اس کے ساتھ چلنے پر رضامند ہو گئی تھی۔ پھوپھی کو اجازت دینے میں تامل ہوا تھا مگر ایک تو نسرین خود جانے پر مصر تھی۔ دوسرے نوجوان کے چہرے سے ایسی معصومیت برس رہی تھی کہ کسی برے ارادے کا گمان تک نہ ہوتا تھا اور وہ خاموش رہ گئی۔

اور اب نسرین نیلے رنگ کا برقعہ اوڑھے نوجوان کے پہلو میں رکشا میں بیٹھی تھی۔ شہر کی کھلی سڑکوں پر ہزاروں عورتوں مردوں کے بہتے ہوئے ہجوم میں یہ جوڑا بھی تھا۔ اسے دیکھ کر کسی کو یہ سوچنے تک کی پرواہ نہ تھی کہ ان کا رشتہ زن وشوہر کے سوا اور بھی کچھ ہو سکتا ہے۔

وہ رکشا سے اتر کر کئی بازاروں میں سے گزرے۔ کئی دکانوں میں گئے۔ جب وہ سڑک پر چلتی تو وہ اس کے آگے پیچھے راستہ صاف کرتا' اسے آنے جانے والی گاڑیوں موٹروں اور ہجوم کی دھکا پیل سے بچاتا یوں اپنی حفاظت میں لے جاتا گویا وہ کوئی بہت مقدس چیز ہے۔ جس کا دامن تک کسی سے چھو جانا اسے گوارا نہیں۔ جب وہ کسی دکان میں داخل ہوتے تو اس کی فرمائش کی چیزیں دکاندار سے منگوا منگوا کر ایسی تکریم سے پیش کرتا کہ دیکھنے والے یہ محسوس کئے بغیر نہ رہ سکتے کہ یہ کوئی نیا جوڑا ہے اور یہ کہ شوہر بیوی سے کمال عشق رکھتا ہے۔

نسرین نے بڑی قیمت کی کوئی ایک چیز نہیں خریدی بلکہ روزمرہ کے استعمال کی چھوٹی چھوٹی چیزیں خریدیں جن میں سے بعض کی واقعی اسے ضرورت تھی' مثلاً ایک تو چھلا خریدا۔ ایک ریشمی ازار بند کچھ چھوٹی بڑی سوئیاں' دو تین مختلف غازے اور بس۔ ان سب چیزوں پر بیس روپے سے کچھ کم ہی خرچ ہوئے۔ ہر ایک چیز خریدنے کے بعد وہ بری ادا کے ساتھ پوچھتی۔ "باقی کیا بچا؟"

واپسی پر نوجوان اسے ایک ریستوران میں لے گیا اور ٹھنڈی اور گرم کئی قسم کی چیزیں منگوائیں اور نسرین کو اپنی مرضی کے خلاف کئی چیزیں کھانی پڑیں۔ جس وقت وہ گھر پہنچے' اچھا خاصا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ نسرین کی پھوپھی بڑے اضطراب سے اس کی راہ دیکھ

رہی تھی۔ جب وہ صحیح سلامت گھر پہنچ گئے تو اس کی جان میں جان آئی۔

شمن سے کہہ دیا گیا تھا کہ وہ کھانا نہیں کھائیں گے۔ چنانچہ شام سے اوپر کی سیڑھیوں کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ نسرین نے پچھلی رات کی طرح پھر کمرے کی ہلکی نیلی روشنی میں کنگھی کرنی شروع کی۔ نوجوان پھر اس کے پاس ہی چاندنی پر لیٹ گیا۔ کچھ دیر دونوں خاموش رہے پھر نوجوان نے کہا۔

''نسرین! میں نے تمہیں نجمی کی بہت سی باتیں بتائیں مگر ایک بات نہیں بتائی۔''

نوجوان نے یہ بات ایسے گھمبیر لہجے میں کہی تھی کہ نسرین بے ساختہ کہہ اٹھی۔ ''وہ کیا؟''

نوجوان کچھ دیر خاموش رہا اور پھر بولا ''وہ یہ کہ وہ... باوفا نہیں تھی۔''

''کیا مطلب؟'' نسرین نے اور بھی متعجب ہو کر پوچھا۔

''مطلب یہ... کہ وہ کسی اور کو چاہتی تھی۔''

''جھوٹ ہے۔''

''نہیں' میں سچ کہہ رہا ہوں۔''

''اس کا کوئی ثبوت بھی تھا؟''

''مجھے ثبوت مل گیا تھا۔''

''وہ کیا؟''

نوجوان لمحہ بھر کے لئے خاموش رہا۔ پھر بولا ''اس کے خط' میں نے غلطی سے اس کے نام کا ایک خط کھول لیا تھا۔'' یہ کہتے کہتے نوجوان ایک دم سخت افسردہ ہو گیا اور اس نے گردن جھکا لی۔

''اور تم پھر بھی اسے چاہتے رہے؟''

''ہاں...'' بھرائی ہوئی آواز میں نوجوان کے منہ سے نکلا۔ ''اس کے سوا چارہ ہی نہ تھا۔''

کئی لمحے خاموشی رہی جسے توڑنے کی کسی میں خواہش پیدا نہ ہوئی۔

''کیا وہ جانتی تھی کہ تم اس کے راز سے واقف ہو؟'' بالآخر نسرین نے پوچھا۔

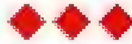
''نہیں' میں نے آخری دم تک اس پر یہ ظاہر نہ ہونے دیا۔ اس کی موت سے چند منٹ پہلے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ سخت نزع

میں ہے اور مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔ مگر میں اس سے آنکھ نہ ملاتا تھا۔ البتہ دلداری اور تشفی کے کلمے برابر میرے منہ سے نکلتے رہے۔ یہاں تک کہ اس نے آخری ہچکی لی اور رخصت ہوگئی۔"

کچھ لمحے پھر خاموشی رہی جس کو خود نوجوان ہی نے توڑا۔ "آخر اس پر یہ ظاہر کرنے کا فائدہ بھی کیا تھا۔"

اس رات پچھلی شب کی بہ نسبت جلد ہی روشنی گل کر دی گئی۔ نوجوان پھر جلد ہی سو گیا۔ مگر نسرین برابر ستاروں کو جھلملاتے دیکھتی رہی۔

پچھلے پہر اچانک نوجوان نے سوتے میں سسکی لی اور پھر تیز تیز سانس لینے شروع کر دیے۔ نسرین نے سر اٹھا کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا' کچھ دیر سوچتی رہی پھر جس طرح کوئی بچہ سوتے سوتے ڈر جائے تو ماں اسے چھاتی سے چمٹا لیتی ہے۔ نسرین نے بھی اسی طرح اس کا سر اپنے بازو میں لے کر اسے اپنی آغوش میں بھینچ لیا۔



اوورکوٹ

جنوری کی ایک شام کو ایک خوش پوش نوجوان ڈیوس روڈ سے گزر کر مال روڈ پر پہنچا اور چیئرنگ کراس کا رخ کر کے خراماں خراماں پٹری پر چلنے لگا۔ یہ نوجوان اپنی تراش خراش سے خاصا فیشن ایبل معلوم ہوتا تھا۔ لمبی لمبی قلمیں چمکتے ہوئے بال' باریک باریک مونچھیں گویا سرمے کی سلائی سے بنائی گئی ہوں بادامی رنگ کا گرم اوورکوٹ پہنے ہوئے جس کے کاج میں شربتی رنگ کے گلاب کا ادھ کھلا پھول اٹکا ہوا' سر پر سبز فلیٹ ہیٹ ایک خاص انداز سے ٹیڑھی رکھی ہوئی سفید سلک کا گلوبند گلے کے گرد لپٹا ہوا ایک ہاتھ کوٹ کی جیب میں دوسرے میں بید کی ایک چھوٹی چھڑی پکڑے ہوئے جسے کبھی کبھی وہ مزے میں آ کے گھمانے لگتا تھا۔

یہ ہفتے کی شام تھی۔ بھرپور جاڑے کا زمانہ۔ سرد اور تند ہوا کسی تیز دھات کی طرح جسم پر آ آ کے لگتی تھی۔ مگر اس نوجوان پر اس کا کچھ اثر نہیں معلوم ہوتا تھا۔ اور لوگ تو خود کو گرم کرنے کے لئے تیز تیز قدم اٹھا رہے تھے مگر اسے اس کی ضرورت نہ تھی۔ جیسے اس کڑکڑاتے جاڑے میں اسے ٹہلنے میں بڑا مزہ آ رہا ہو۔

اس کا چال ڈھال سے ایسا بانکپن ٹپکتا تھا کہ تانگے والے دور ہی سے دیکھ کے سرپٹ گھوڑا دوڑاتے ہوئے اس کی طرف لپکتے۔ مگر وہ چھڑی کے اشارے سے نہیں کر دیتا۔ ایک خالی ٹیکسی بھی اسے دیکھ کر رکی مگر اس نے ''نو تھینک یو'' کہہ کر اسے بھی ٹال دیا۔

جیسے جیسے وہ مال کے زیادہ بارونق حصے کی طرف پہنچتا جاتا تھا۔ اس کی چونچالی بڑھتی ہی جاتی تھی۔ وہ منہ سے سیٹی بجا کر رقص کی ایک انگریزی دھن نکالنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے پاؤں بھی تھرکتے ہوئے اٹھنے لگے۔ ایک دفعہ جب آس پاس کوئی نہیں تھا تو یکبارگی کچھ ایسا جوش آیا کہ اس نے دوڑ کر جھوٹ موٹ بال دینے کی کوشش کی' گویا کرکٹ کا کھیل ہو رہا ہو۔

راستے میں وہ سڑک آئی جو لارنس گارڈن کی طرف جاتی تھی۔ مگر اس وقت شام کے دھندلکے اور سخت کہرے میں اس باغ پر کچھ ایسی اداسی برس رہی تھی کہ اس نے ادھر کا رخ نہ کیا اور سیدھا چیئرنگ کراس کی طرف چلتا رہا۔

ملکہ کے بت کے قریب پہنچ کر اس کی حرکات و سکنات میں کسی قدر متانت پیدا ہو گئی۔ اس نے اپنا رومال نکالا جسے جیب میں رکھنے کی بجائے اس نے کوٹ کی بائیں آستین میں اڑس رکھا تھا اور ہلکے ہلکے چہرے پر پھیرا۔ تاکہ کچھ گرد جم گئی ہو تو اتر جائے۔ بت کے آس پاس لان کے ایک گوشے میں کچھ انگریز بچے ایک بڑی سی گیند سے کھیل رہے تھے۔ وہ رک گیا اور بڑی دلچسپی سے ان کا

کھیل دیکھنے لگا۔ بچے کچھ دیر تو اس کی نظروں سے بے پروا کھیل میں مصروف رہے مگر جب وہ تکے ہی چلا گیا تو وہ رفتہ رفتہ شرمانے سے لگے اور پھر اچانک گیند سنبھال ہنستے ہوئے اور ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے وہ گھاس کے اس ٹکڑے ہی سے چلے گئے۔

نوجوان کی نظر سیمنٹ کی ایک خالی بنچ پر پڑی اور اس پر آ کے بیٹھ گیا۔ اس وقت شام کے اندھیرے کے ساتھ ساتھ سردی اور بھی بڑھتی جا رہی تھی اس کی یہ شدت ناخوشگوار نہ تھی بلکہ لذت پرستی کی ترغیب دیتی تھی۔ شہر کے عیش پسند طبقے کا تو کہنا ہی کیا وہ تو اس بہانے کچھ زیادہ کھل کھیلتا ہے تنہائی میں بسر کرنے والے بھی اس سے ورغلائے جاتے ہیں اور وہ اپنے اپنے کونوں کھدروں سے نکل محفلوں اور مجمعوں میں جانے کی سوچنے لگتے ہیں تاکہ جسموں کے قرب سے گرمی حاصل ہو۔ حصول لذت کی یہی جستجو لوگوں کو مال پر کھینچ لائی تھی اور وہ حسب توفیق ریستورانوں' کافی ہاؤسوں' رقص گاہوں' سینماؤں اور تفریح کے دوسرے مقاموں پر محظوظ ہو رہے تھے۔

مال روڈ پر موٹروں تانگوں اور سائیکلوں کا تانتا بندھا ہوا تو تھا ہی پٹری پر چلنے والوں کی بھی کثرت تھی۔ علاوہ ازیں سڑک کی دو رویہ دکانوں میں خرید و فروخت کا بازار بھی گرم تھا۔ جن کم نصیبوں کو نہ تفریح طبع کی استطاعت تھی نہ خرید و فروخت کی وہ دور ہی سے کھڑے ان تفریح گاہوں اور دوکانوں کی رنگارنگ روشنیوں سے جی بہلا رہے تھے۔

نوجوان سیمنٹ کی بنچ پر بیٹھا اپنے سامنے سے گزرتے ہوئے زن و مرد کو غور سے دیکھ رہا تھا اس کی نظر ان کے چہروں سے کہیں زیادہ ان کے لباس پر پڑتی تھی۔ ان میں ہر وضع اور ہر قماش کے لوگ تھے۔ بڑے بڑے تاجر' سرکاری افسر' لیڈر' فنکار' کالجوں کے طلبا و طالبات' زمیں' اخباروں کے نمائندے' دفتروں کے بابو' زیادہ تر لوگ اوورکوٹ پہنے ہوئے تھے۔ ہر قسم کے اوورکوٹ قراقلی کے بیش قیمت اوورکوٹ سے لے کر خاکی پٹی کے پرانے فوجی اوورکوٹ تک جسے نیلام میں خریدا گیا تھا۔

نوجوان کا اپنا اوورکوٹ تھا تو خاصا پرانا مگر اس کا کپڑا خوب بڑھیا تھا پھر وہ سلا ہوا بھی کسی ماہر درزی کا تھا۔ اس کو دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کی بہت دیکھ بھال کی جاتی ہے۔ کالر خوب جما ہوا تھا۔ بانہوں کی کریز بڑی نمایاں' سلوٹ کہیں نام کو نہیں' بٹن سینگ کے بڑے بڑے چمکتے ہوئے' نوجوان اس میں بہت مگن معلوم ہوتا تھا۔

ایک لڑکا پان بیڑی' سگریٹ کا صندوقچہ گلے میں ڈالے سامنے سے گزرا نوجوان نے آواز دی۔ "پان والا"

"جناب"

"دس کا چینج ہے؟"

"ہے تو نہیں' لا دوں گا۔ کیا لیں گے آپ؟"

''نوٹ لے کے بھاگ گیا تو؟''

''اجی واہ' کوئی چور اچکا ہوں جو بھاگ جاؤں گا۔ اعتبار نہ ہو تو میرے ساتھ چلئے۔ لیں گے کیا آپ؟''

''نہیں نہیں ہم خود چینج لائے گا۔ لو یہ اکنی نکل آئی۔ ایک سگریٹ دے جاؤ اور چلے جاؤ۔''

لڑکے کے جانے کے بعد مزے مزے سے سگریٹ کے کش لگانے لگا۔ وہ ویسے ہی بہت خوش نظر آتا تھا سگریٹ کے دھوئیں نے اس پر سرور کی کیفیت طاری کر دی۔

ایک چھوٹی سی سفید رنگ بلی سردی میں ٹھٹھری ہوئی بنچ کے نیچے اس کے قدموں کے پاس آ کر میاؤں میاؤں کرنے لگی۔ اس نے پچکارا تو اچھل کر بنچ پر آ چڑھی۔ اس نے پیار سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور کہا۔

''پور لٹل سول''

اس کے بعد وہ بنچ سے اٹھ کر کھڑا ہوا اور سڑک کو پار کر کے اس طرف چلا جدھر سینما کی رنگ برنگی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ تماشا شروع ہو چکا تھا۔ سینما کے برآمدے میں بھیڑ نہ تھی۔ صرف چند لوگ تھے جو آنے والے فلموں کی تصویروں کا جائزہ لے رہے تھے۔ یہ تصویریں چھوٹے بڑے کئی بورڈوں پر چسپاں تھیں۔ ان میں کہانی کے چیدہ چیدہ مناظر دکھائے گئے تھے۔

تین نوجوان اینگلو انڈین لڑکیاں ان تصویروں کو ذوق وشوق سے دیکھ رہی تھیں۔ ایک خاص شان استغنا کے ساتھ مگر صنف نازک کا پورا پورا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے وہ بھی ان کے ساتھ ساتھ مگر مناسب فاصلے سے ان تصویروں کو دیکھتا رہا۔ لڑکیاں آپس میں ہنسی مذاق کی باتیں بھی کرتی جاتی تھیں اور فلم پر رائے زنی بھی۔ اتنے میں ایک لڑکی نے' جو اپنی ساتھ والیوں سے زیادہ حسین بھی تھی اور شوخ بھی۔ دوسری لڑکی کے کان میں کچھ کہا۔ جسے سن کر اس نے ایک قہقہہ لگایا اور پھر وہ تینوں ہنستی ہوئی باہر نکل گئیں۔ نوجوان نے اس کا کچھ اثر قبول نہ کیا اور تھوڑی دیر کے بعد وہ خود بھی سینما کی عمارت سے باہر نکل آیا۔

اب سات بج چکے تھے اور وہ مال کی پٹڑی پر پھر پہلے کی طرح سڑگشت کرتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ ایک ریستوران میں آرکسٹرا بج رہا تھا۔ اندر سے کہیں زیادہ باہر لوگوں کا ہجوم تھا۔ ان میں زیادہ تر موٹروں کے ڈرائیور' کوچوان' پھل بیچنے والے جو اپنا مال بیچ کے خالی ٹوکرے لئے کھڑے تھے۔ کچھ راہ گیر جو چلتے چلتے ٹھہر گئے تھے کچھ مزدوری پیشہ لوگ تھے اور کچھ گداگر۔ یہ اندر والوں سے کہیں زیادہ گانے کے رسیا معلوم ہوتے تھے کیونکہ وہ غل غپاڑہ نہیں مچا رہے تھے بلکہ خاموشی سے نغمہ سن رہے تھے۔ حالانکہ دھن اور ساز اجنبی تھے۔ نوجوان پل بھر کے لیے رکا اور پھر آگے بڑھ گیا۔

تھوڑی دور چل کے اسے انگریزی موسیقی کی ایک بڑی سی دکان نظر آئی اور وہ بلاتکلف اندر چلا گیا۔ ہر طرف شیشے کی الماریوں میں طرح طرح کے انگریزی ساز رکھے ہوئے تھے۔ ایک لمبی میز پر مغربی موسیقی کی دو ورقی کتابیں چنی تھیں۔ یہ نئے چلنتر گانے تھے۔ سرورق خوبصورت رنگ دار مگر دھنیں گھٹیا۔ ایک چھچلتی ہوئی نظر ان پر ڈالی پھر وہاں سے ہٹ آیا اور سازوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ایک ہسپانوی گٹار پر جو ایک کھونٹی سے ٹنگی ہوئی تھی ناقدانہ نظر ڈالی اور اس کے ساتھ قیمت کا جو ٹکٹ لٹک رہا تھا اسے پڑھا۔ اس سے ذرا ہٹ کر ایک بڑا جرمن پیانو رکھا ہوا تھا۔ اس کا کور اٹھا کے انگلیوں سے بعض پردوں کو ٹٹولا اور پھر کور بند کر دیا۔

پیانو کی آواز سن کر دکان کا ایک کارندہ اس کی طرف بڑھا۔ ''گڈ ایوننگ سر' کوئی خدمت؟''

''نہیں شکریہ' ہاں گراموفون ریکارڈوں کی فہرست دے دو اس مہینے کی۔''

فہرست لے کے اوورکوٹ کی جیب میں ڈالی۔ دکان سے باہر نکل آیا اور پھر چلنا شروع کر دیا۔ راستے میں ایک چھوٹا سا بک اسٹال آیا۔ نوجوان یہاں بھی رکا' کئی تازہ رسالوں کے ورق الٹے۔ رسالہ جہاں سے اٹھاتا بڑی احتیاط سے وہیں رکھ دیتا اور آگے بڑھا تو قالینوں کی ایک دکان نے اس کی توجہ کو جذب کیا۔ مالک دکان نے جو ایک لمبا سا چغہ پہنے اور سر پر کلار کھے تھا۔ گرمجوشی سے اس کی آؤ بھگت کی۔

''ذرا یہ ایرانی قالین دیکھنا چاہتا ہوں۔ اتاریئے نہیں۔ یہیں دیکھ لوں گا۔ کیا قیمت ہے اس کی؟''

''چودہ سو بتیس روپے''

نوجوان نے اپنی بھنوؤں کو سکیڑا' جس کا مطلب تھا۔ ''اوہو اتنی!''

دکاندار نے کہا'' آپ پسند کر لیجئے ہم جتنی بھی رعایت کر سکتے ہیں کر دیں گے۔''

''شکریہ' لیکن اس وقت تو میں صرف ایک نظر دیکھنے آیا ہوں۔''

''شوق سے دیکھئے' آپ ہی کی دکان ہے۔''

دو تین منٹ کے بعد اس دکان سے بھی نکل آیا۔ اس کے اوورکوٹ کے کاج میں شربتی رنگ کا جو ادھ کھلا پھول اٹکا ہوا تھا وہ اس وقت کاج سے کچھ زیادہ باہر نکل آیا تھا۔ جب وہ اس کو ٹھیک کر رہا تھا تو اس کے ہونٹوں پر ایک خفیف اور پر اسرار مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس نے پھر اپنی مٹرگشت شروع کر دی۔

اب وہ ہائیکورٹ کی عمارتوں کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ اتنا کچھ چل لینے کے بعد بھی اس کی فطری چونچالی میں کچھ فرق نہیں آیا

تھا۔ نہ تکان محسوس ہوئی تھی نہ اکتاہٹ۔ یہاں پٹری میں چلنے والوں کی ٹولیاں کچھ چھٹ سی گئی تھیں اور ان میں کافی فصل رہنے لگا تھا۔ اس نے اپنی بید کی چھڑی کو ایک انگلی پر گھمانے کی کوشش کی۔ مگر کامیابی نہ ہوئی اور چھڑی زمین پر گر پڑی ''اوہ سوری'' کہہ کر زمین پر جھکا اور چھڑی کو اٹھالیا۔

اس اثنا میں ایک نوجوان جوڑا جو اس کے پیچھے پیچھے چلا آرہا تھا اس کے پاس سے گزر کر آگے نکل آیا۔ لڑکا دراز قامت تھا اور سیاہ کوڑرائے کی پتلون اور زپ والی چمڑے کی جیکٹ پہنے تھا اور لڑکی سفید ساٹن کی گھیر دار شلوار اور سبز رنگ کا کوٹ۔ وہ بھاری بھرکم سی تھی۔ اس کے بالوں میں ایک لمبا سا سیاہ چٹلا گندھا ہوا تھا جو اس کی کمر سے بھی نیچا تھا۔ لڑکی کے چلنے سے اس چٹلے کا پھندنا اچھلتا کودتا پے در پے اس کے فربہ جسم سے ٹکراتا۔ نوجوان کے لئے جو اب ان کے پیچھے پیچھے آرہا تھا یہ نظارہ خاصا جاذب نظر تھا۔ وہ جوڑا کچھ دیر تک تو خاموش چلتا رہا۔ اس کے بعد لڑکے نے کچھ کہا۔ جس کے جواب میں لڑکی اچانک چمک کر بولی۔ ''ہرگز نہیں' ہرگز نہیں' ہرگز نہیں۔''

''سنو میرا کہنا مانو۔'' لڑکے نے نصیحت کے انداز میں کہا۔ ''ڈاکٹر میرا دوست ہے' کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی۔''

''نہیں نہیں نہیں''

''میں کہتا ہوں تمہیں ذرا تکلیف نہ ہوگی۔''

لڑکی نے کچھ جواب نہ دیا۔

''تمہارے ماں باپ کو کتنا رنج ہوگا۔ ذرا ان کی عزت کا بھی تو خیال کرو''

''چپ رہو ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گی۔''

نوجوان نے شام سے اب تک اپنی سیر گشت کے دوران میں جتنی انسانی شکلیں دیکھی تھیں ان میں سے کسی نے بھی اس کی توجہ کو اپنی طرف منعطف نہیں کیا تھا۔ فی الحقیقت ان میں کوئی جاذبیت تھی ہی نہیں۔ یا پھر وہ اپنے حال میں ایسا مست تھا کہ کسی دوسرے سے اسے سروکار ہی نہ تھا۔ مگر اس دلچسپ جوڑے نے جس میں کسی افسانے کے کرداروں کی سی ادا تھی' جیسے یکبارگی اس کے دل کو موہ لیا تھا اور اسے حد درجہ مشتاق بنا دیا کہ وہ ان کی اور بھی باتیں سنے اور ہو سکے تو قریب سے ان کی شکلیں بھی دیکھ لے۔

اس وقت وہ تینوں بڑے ڈاک خانے کے چوراہے کے پاس پہنچ گئے۔ لڑکا اور لڑکی پل بھر کو رکے اور پھر سڑک پار کر کے میکلوڈ روڈ چل پڑے۔ نوجوان مال روڈ پر ہی ٹھہرا رہا۔ شاید وہ سمجھتا تھا کہ فی الفور ان کے پیچھے گیا تو ممکن ہے انہیں شبہ ہو جائے کہ ان کا

تعاقب کیا جا رہا ہے اس لئے اسے کچھ لمحے رک جانا چاہیے۔

جب وہ لوگ کوئی سو گز آگے نکل گئے تو اس نے لپک کر ان کا پیچھا کرنا چاہا۔ مگر ابھی اس نے آدھی ہی سڑک پار کی ہوگی کہ اینٹوں سے بھری ہوئی ایک لاری پیچھے سے بگولے کی طرح آئی اور اسے کچلتی ہوئی میکلوڈ روڈ کی طرف نکل گئی۔ لاری کے ڈرائیور نے نوجوان کی چیخ سن کر پل بھر کے لیے گاڑی کی رفتار کم کی۔ پھر وہ سمجھ گیا کہ کوئی لاری کی لپیٹ میں آ گیا اور وہ رات کے اندھیرے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لاری کو لے بھاگا۔ دو تین راہ گیر جو اس حادثے کو دیکھ رہے تھے' شور مچانے لگے۔ نمبر دیکھو' نمبر دیکھو۔ مگر لاری ہوا ہو چکی تھی۔

اتنے میں کئی اور لوگ جمع ہو گئے۔ ٹریفک کا انسپکٹر جو موٹر سائیکل پر جا رہا تھا رک گیا۔ نوجوان کی دونوں ٹانگیں بالکل کچلی گئی تھیں۔ بہت سا خون نکل چکا تھا اور وہ سسک رہا تھا۔

فوراً ایک کار کو روکا گیا اور اسے جیسے تیسے اس میں ڈال کر بڑے ہسپتال روانہ کر دیا گیا جس وقت وہ ہسپتال پہنچا تو اس میں ابھی رمق بھر جان باقی تھی۔

اس ہسپتال کے شعبہ حادثات میں اسسٹنٹ سرجن مسٹر خان اور دو نو عمر نرسیں مس شہناز اور مس گل ڈیوٹی پر تھیں۔ جس وقت اسے سٹریچر پر ڈال کر آپریشن روم میں لے جایا جا رہا تھا تو ان نرسوں کی نظر اس پر پڑی۔ اس کا بادامی رنگ کا اوورکوٹ ابھی تک اس کے جسم پر تھا اور سفید سلک کا مفلر گلے میں لپٹا ہوا تھا۔ اس کے کپڑوں پر جا بجا خون کے بڑے بڑے دھبے تھے۔ کسی نے از راہ دردمندی اس کی سبز فلیٹ ہیٹ اٹھا کے اس کے سینہ پر رکھ دی تھی تا کہ کوئی اڑا نہ لے جائے۔

شہناز نے گل سے کہا۔ ''کسی بھلے گھر کا معلوم ہوتا ہے۔''

گل دبی آواز میں بولی۔ ''خوب بن ٹھن کے نکلا تھا بے چارہ ہفتے کی شام منانے۔''

''ڈرائیور پکڑا گیا یا نہیں؟''

''نہیں بھاگ گیا۔''

''کتنے افسوس کی بات ہے۔''

آپریشن روم میں اسسٹنٹ سرجن اور نرسیں چہروں پر جراحی کے نقاب چڑھائے جنہوں نے ان کی آنکھوں سے نیچے کا سارا حصہ چھپا رکھا تھا' اس کی دیکھ بھال میں مصروف تھے۔ اسے سنگ مرمر کی میز پر لٹا دیا گیا۔ اس نے سر میں جو تیز خوشبودار تیل ڈال

رکھا تھا۔ اس کی کچھ کچھ مہک ابھی تک باقی تھی۔ پٹیاں ابھی تک جمی ہوئی تھیں۔ حادثے سے اس کی دونوں ٹانگیں ٹوٹ چکی تھیں مگر سر کی مانگ نہیں بگڑنے پائی تھی۔

اب اس کے کپڑے اتارے جا رہے تھے۔ سب سے پہلے سفید سلک کا گلوبند اس کے گلے سے اتارا گیا۔ اچانک نرس شہناز اور نرس گل نے بیک وقت ایک دوسرے کی طرف دیکھا' اس سے زیادہ وہ کر بھی کیا سکتی تھیں۔ چہرے جو دلی کیفیات کا آئینہ ہوتے ہیں جراحی کے نقاب تلے چھپے ہوئے تھے اور زبانیں بند۔

نوجوان کے گلوبند کے نیچے نکٹائی اور کالر کیا' سرے سے قمیض ہی نہیں تھی۔ اوورکوٹ اتارا گیا تو نیچے سے ایک بہت بوسیدہ اونی سویٹر نکلا جس میں جا بجا بڑے بڑے سوراخ تھے۔ ان سوراخوں سے سویٹر سے بھی زیادہ بوسیدہ اور میلا کچیلا ایک بنیان نظر آ رہا تھا۔ نوجوان سلک کے گلوبند کو کچھ اس ڈھب سے گلے پر لپیٹے رکھتا تھا کہ اس کا سارا سینہ چھپا رہتا تھا۔ اس کے جسم پر میل کی تہیں بھی خوب چڑھی ہوئی تھیں۔ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کم سے کم پچھلے دو مہینے سے نہیں نہایا البتہ گردن خوب صاف تھی اور اس پر ہلکا ہلکا پوڈر لگا ہوا تھا۔ سویٹر اور بنیان کے بعد پتلون کی باری آئی اور شہناز اور گل کی نظریں پھر بیک وقت اٹھیں۔

پتلون کو پیٹی کی بجائے ایک پرانی دھجی سے جو شاید کبھی نکٹائی ہو گی خوب کس کے باندھا گیا تھا۔ بٹن اور بکسوئے غائب تھے۔ دونوں گھٹنوں پر سے کپڑا مسک گیا تھا اور کئی جگہ کھونچیں لگی تھیں مگر چونکہ یہ حصے اوورکوٹ کے نیچے تھے رہتے تھے۔ اس لئے لوگوں کی ان پر نظر نہیں پڑتی تھی۔

اب بوٹ اور جرابوں کی باری آئی اور ایک مرتبہ پھر مس شہناز اور مس گل کی آنکھیں چار ہوئیں۔



سایہ

دن بھر جیسے جیسے سائے گھٹتے بڑھتے اور زاویے بدلتے رہتے۔ سبحان کی دکان بھی جگہیں بدلتی رہتی۔ صبح کو سورج نکلنے سے پہلے ہی وہ اپنا ٹھیلہ وکیل صاحب کے مکان کے سامنے سڑک کے اس کنارے لا کھڑا کرتا۔ اس طرف کوئی عمارت نہ تھی۔ زمین بھوبھل کی طرح تھی اور تھوڑی سی ڈھلوان کے بعد ایک میدان آتا تھا۔ جس میں پیپل کا ایک پرانا پیڑ تھا۔ جب سورج وکیل صاحب کے چو منزلے مکان کے پیچھے سے ابھرتا اور دھوپ دھیرے دھیرے پیپل کی چوٹی سے اترنی شروع ہوتی اور کوئی دو ڈھائی گھنٹے میں مکان کا احاطہ کرتی' ڈھلوان پر چڑھتی ہوئی سڑک کے کنارے تک پہنچ جاتی تو وہ اپنا فیصلہ سڑک کے اس کنارے وکیل صاحب کے مکان کے زینے کے ساتھ ملا کر کھڑا کر دیتا اور یوں اس اونچے مکان کا سایہ دو تین گھنٹے تک اور اسے دھوپ سے بچائے رکھتا۔

لیکن جب سورج عین سر پر آ جاتا اور سایہ مختصر ہوتے ہوتے ایک لکیر سی بن کے رہ جاتا تو اسے ناچار اپنا ٹھیلہ ڈھلوان پر سے دھکیل کر میدان میں پیپل تلے لے جانا پڑتا۔ جہاں وہ دو تین بجے تک ڈیرا جمائے رہتا۔ اس کے بعد سورج ڈھلنا شروع ہو جاتا تو پیپل کے سائے کے ساتھ ساتھ اس کی دکان بھی آگے سرکنی شروع ہو جاتی۔ یہاں تک کہ شام ہوتے ہوتے وہ پھر وکیل صاحب کے مکان کے سامنے سڑک کے اسی کنارے پر پہنچ جاتا۔ جہاں زمین بھوبل کی طرح تھی اور جہاں اس نے علی الصبح ٹھیلہ کھڑا کیا تھا۔ خاص طور پر گرمیوں میں اس کی دکان یوں ہی جگہیں بدلتی رہتی تھی۔

وکیل صاحب کا مکان سبحان کو دھوپ ہی سے پناہ نہ دیتا تھا بلکہ اس کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ بھی تھا۔ وکیل صاحب ایک وسیع کنبے کے سرپرست تھے۔ ان کا شمار شہر کے مشہور وکیلوں میں ہوتا تھا۔ بڑے بااخلاق' ملنسار اور مہمان نواز۔ جب تک گھر پر رہتے' ملنے والوں کا تانتا لگا رہتا' کچہری جاتے تو پیچھے بیگم صاحب ان کی ہر دلعزیزی کو برقرار رکھتیں۔ ان کی اپنی ملنے والیاں بھی کچھ کم نہ تھیں۔ اس پر وکیل صاحب کے موکلوں کی بیویوں کی مدارت کرنا بھی ان کے فرائض میں داخل تھا۔ چنانچہ سبحان کے ٹھیلے سے سوڈا لیمن کی بوتلوں' برف' پان' سگریٹ وغیرہ کی تھاک بندھی رہتی۔

یہ علاقہ شہر کے سرے پر تھا جہاں شہر کی حد ختم ہوتی تھی اور کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ اس جگہ مکان خال خال ہی تھے اور کوئی دکان قریب نہ تھی بھلا دو ایک گھروں کے آسرے کون ایک مستقل دکان کا متحمل ہو سکتا۔ رہا سبحان' اس کی بات دوسری تھی۔ اول تو اس

کے ٹھیلے کا خرچ ہی کیا تھا۔ کرایہ دینا پڑتا تھا نہ بجلی پانی کا بل۔ پھر دنیا میں کوئی رشتہ دار تھا نہ عزیز نہ در۔ اس کی ضروریات زندگی اس قدر مختصر تھیں کہ صرف وکیل صاحب کے مکان کی آمدنی ہی سے پوری ہو جاتی تھیں اور وہ شہر کے چوکوں کے ٹھیلے والوں اور دوسرے دکانداروں کی باہمی چشمکوں سے الگ تھلگ اس سنسان مگر عافیت کی جگہ میں خوش تھا۔

وکیل صاحب نے جب نئی نئی وکالت شروع کی تھی تو انہیں مجبوراً شہر کے ایک بارونق بازار میں رہنا پڑا تھا۔ چھوٹا سا مکان کرایہ حد سے بڑھا ہوا مگر رفتہ رفتہ جب کام چل نکلا اور لوگ ان کو جاننے لگے تو انہوں نے اس نواح میں ایک موکل کی زمین سستے داموں خرید لی۔ یہ زمین ایک عرصے تک یونہی پڑی رہی۔ رفتہ رفتہ جب انہوں نے تعمیر کے لئے روپیہ جمع کر لیا اور اپنے حسب منشا مکان بنوالیا تو وہ اپنے وسیع کنبے کو لے کر اس میں اٹھ آئے ان کے قدم سے تھوڑے ہی دنوں میں اس علاقے میں زندگی کے آثار نظر آنے شروع ہو گئے۔ دور دور سے تانگے والے ان کے موکلوں کو لے کر یہاں پہنچنے لگے۔ چونکہ وکیل صاحب خود بھی تانگے ہی میں بیٹھ کر کچہری جایا کرتے تھے۔ اس لئے دو ایک تانگے صبح شام ان کے مکان کے آس پاس کھڑے نظر آنے لگے۔ کبھی کبھی کوئی موٹر بھی تھوڑی دیر کے لئے ان کے مکان کے نیچے رک کر اس نواح کی رونق بڑھا جاتی۔

وکیل صاحب کے گھر کے علاوہ سبحان کی آمدنی کا ذریعہ یوں تو وہ اکا دکا راہ گیر بھی تھے جو شہر سے دیہات یا دیہات سے شہر جاتے ہوئے اس سے دو ایک پیسے کی بیڑیاں‘ گڑ کی ریوڑیاں یا بھنے ہوئے چنے خریدنے ٹھہر جاتے۔ مگر ان سے دریافت کم اور کوفت زیادہ ہوتی۔ خصوصاً اس وقت جب دیہاتنیں سر ٹھوڑی پر دوپٹے کے بل دیئے‘ ناک اور منہ چھپائے اپنی پھٹی جوتیاں گھسیٹ گھسیٹ کر چلتیں تو سڑک پر گرد و غبار کا ایک طوفان سا اٹھ کھڑا ہوتا اور سبحان کو سوڈے کی بوتلوں سے گرد دور کرنے کے لئے پانی کا ایک اور چھینٹا دینا پڑتا۔

ان راہ گیروں سے کہیں زیادہ اس کی بکری تانگے والوں سے ہوتی تھیں جو یوں تو کمر کے نیچے سے پھٹا ہوا خاکی پاجامہ پہنتے ہوتے مگر قینچی سے کم درجے کا سگریٹ پینا ان کی طبع کو پسند نہ تھا اور جب پیاس لگتی تو پانی کی بجائے برف میں لگے ہوئے لیمن کے ادھے سے ان کی تسکین ہوتی تھی۔

کبھی کبھار ایسا ہوتا کہ جب سبحان دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں لاوارث سانڈوں‘ کتوں‘ بھک منگے لڑکوں کے ساتھ پیپل کے سائے تلے پناہ لے رہا ہوتا اور بکری سے بے نیاز اسٹول پر بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگتا تو ایسے میں کوئی دیہاتی بارات دولہا دلہن سمیت‘ پسینے میں شرابور‘ گلے ماتھے اور کلائیوں پر سستے ریشمی کپڑوں کا رنگ لگا ہوا‘ پیاس سے ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی اس پیپل تلے ستانے

اور پڑاؤ کرنے پر مجبور ہو جاتی اور سبحان کی کئی دنوں کی کسر ایک دن میں نکل جاتی۔

سبحان کو اس علاقے میں ٹھیلہ لگاتے پانچ برس ہو چکے تھے۔ یہی ایک ایسا کام تھا جو اس نے ایک جگہ جم کر اتنے عرصے تک کیا تھا۔ ورنہ اس کی ساری عمر گھومنے پھرنے میں گزر گئی تھی۔ ابھی وہ دس برس کا بھی نہ ہوا تھا کہ فکر معاش نے اسے گھر سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے بچپن اور جوانی میں بیسیوں دھندے کیے تھے۔ آج اس شہر میں تو کل اس شہر میں۔ کبھی کسی گھر میں اوپر کے کام پر ملازم ہے تو کبھی کسی دفتر میں چپڑاسی ہے۔ کبھی ریلوے شاپ میں' تو کبھی چھاپے خانے میں۔ کچھ عرصہ فوج میں بھی رہا۔ جب تک ہاتھ پاؤں میں سکت رہی آزاد مزدوری کو ہر کام پر ترجیح دی مگر جب جوانی گزر گئی اور بڑھاپے کے آثار نمودار ہونے شروع ہو گئے تو طبیعت محنت مشقت سے خود بخود بھاگنے لگی۔ آخر اس نے اتنی رقم جمع کر لی کہ ایک ٹھیلہ خرید لے۔ پہلے پہل اس نے پھل اور سبزیاں ٹھیلے پر رکھ کر شہر کا چکر لگانا شروع کیا۔ مگر تھوڑے ہی دنوں میں اس کام سے بددل ہو گیا۔ اول تو منڈی کے بھاؤ کو سمجھنا اور مول تول کرنا اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ وہ مال کو پرکھنے میں بہت جلد دھوکہ کھا جاتا۔ پھر مال نہ بکے تو گل سڑ کر یا باسی ہو کر خراب ہو جاتا اور پھر یہ کہ دوسرے ٹھیلے والوں سے خواہ مخواہ کے جھگڑے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ دن بھر پولیس والوں کی گھرکیاں اور جھڑکیاں سہنی پڑتی تھیں۔ چنانچہ اس نے زیادہ منافع کے خیال کو چھوڑ کر پان سگریٹ کی دکان پر اکتفا کیا اور شہر کا ایک ایسا الگ تھلگ گوشہ تلاش کر لیا جہاں کسی قدر چین سے زندگی کے دن پورے کر سکے۔

ادھر وکیل صاحب یہ دیکھ کر کہ یہ دکان محض ان کے گھر کے آسرے ہی پر لگائی گئی ہے اس کی سرپرستی کرنا اپنا فرض سمجھنے لگے تھے۔ چنانچہ ماما اور نوکروں کو تاکید تھی کہ سب اس سے سودا خریدیں اور اگر کچھ شکایت ہو یا چیزیں مہنگی معلوم ہوں تو ان کو اطلاع دیں۔ مگر سبحان کسی قسم کی شکایت کا موقع ہی نہ آنے دیتا وہ نوکروں سے ہنسی مذاق کی باتیں کر کے اور ایک آدھ پان یا بیڑی مفت کھلا پلا کے ہمیشہ انہیں خوش رکھنے کی کوشش کیا کرتا۔

یوں بھی وہ ہنس اور طبیعت کا نیک تھا۔ لگائی بجھائی کی عادت نہ تھی۔ اس لئے سب سے خوب بنتی تھی۔ ٹھیلہ لگانے کے ساتھ ہی اس نے ڈاڑھی رکھ لی تھی۔ لبیں کتروانے لگا تھا۔ خشخشی داڑھی تنکوں کی بنی ہوئی مخروطی وضع کی ایک ہلکی پھلکی ٹوپی ہر وقت سر پر رہا کرتی۔ چارخانہ تہمد' گاڑھے کا کرتا' اس پر خاکی زین کا کوٹ اپنی اس وضع سے وہ خاصا دیندار معلوم ہوتا تھا۔ حالانکہ صوم وصلوٰۃ سے اسے کوئی واسطہ نہ تھا۔

ان پانچ برس میں جو اس نے وکیل صاحب کے مکان کے سائے میں گزارے تھے وہ ان کے خاندان کے بہت سے حالات

سے آگاہ ہوگیا تھا۔ اسے ایک ایک فرد کے عادات واطوار کا علم تھا۔ یہاں تک کہ پردے میں رہنے والی عورتوں کا ناک نقشہ ان کی سیرت اور سجاؤ بھی اس سے چھپا ہوا نہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بیگم صاحب کے سارے بچے ایک ہی چھاتی کا دودھ پی کر پلے ہیں کیونکہ دوسری چھاتی میں دودھ نہیں اترتا۔ وہ جانتا تھا کہ منجھلی صاحبزادی سب بہن بھائیوں سے زیادہ غصیلی ہے۔ وہ جانتا تھا کہ وکیل صاحب کے والد ماجد میر صاحب بڑے قصاب تھے' مگر بیٹے کے کہنے پر انہوں نے وہ پیشہ چھوڑ دیا تھا۔ غرض کئی اور ایسی باتیں جن کا وکیل صاحب کے بہت سے ملنے والوں کو سان گمان بھی نہ ہوسکتا تھا۔

اسی طرح اسے مکان کے ایک ایک حصے اور اس کی آرائش کا حال بھی معلوم تھا۔ حالانکہ گھر تو گھر اس نے کبھی سیڑھیوں میں بھی قدم نہ رکھا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کس کمرے میں کون رہتا ہے۔ وکیل صاحب کا دیوان خانہ کہاں ہے۔ بیگم صاحب ملنے والیوں سے کہاں ملاقات کرتی ہے۔ بڑی صاحبزادیاں اور صاحبزادے رات کو کہاں سوتے ہیں۔ ہارمونیم کون بجاتا ہے۔ وہ پرانا بڑا کلاک جس کا گھنٹہ رات کو پچھلے پہر کے سناٹے میں سنائی دیا کرتا ہے' کس کمرے میں ہے۔ باورچی خانہ کس منزل پر ہے اور بوڑھے میر صاحب اور نوکر چاکر کس طرح رہتے سہتے ہیں۔

یہ باتیں اسے کچھ تو بچوں کے بھولے پن سے' کچھ نوکروں کی بے احتیاطی سے اور کچھ خود اپنی ٹوہ لگانے کی عادت سے معلوم ہو گئی تھیں لیکن انہیں معلوم کرنے میں کسی بری نیت کا دخل نہ تھا۔ بس اسے انسانی ہمدردی کہہ لیجئے یا دل بہلاوے کی ایک صورت۔ آخر زندگی میں کچھ لگاؤ تو ہونا ہی چاہیے تھا۔ ورنہ اس ویرانے میں ایک ایسے شخص کا جس کے آگے پیچھے کوئی نہ ہو' دن گزارنا اجیرن ہو جاتا۔

اس پانچ سال کے عرصے میں سبحان کے سامنے وکیل صاحب کے خاندان میں دو نئے رکنوں کا اضافہ ہوا تھا۔ ایک صاحبزادہ' ایک صاحبزادی۔ ان سے پہلے جو صاحبزادے گودوں میں رہتے تھے' وہ اب بہن کی انگلی پکڑے سبحان کی دکان سے اپنے لئے مٹھائی کی گولیاں لینے خود آنے لگے تھے۔ ان کے لئے ابھی پاجامہ پہننا ضروری نہیں سمجھا گیا تھا۔

ان بہن بھائیوں سے دو بڑے صاحبزادے علی الصبح سب سے پہلے مکان سے نکلتے۔ ایک کی عمر نو برس' دوسرے کی گیارہ برس' ایک ہی طرح کے کوٹ' ایک ہی طرح کی ٹوپیاں' ایک ہی طرح کے بستے۔ اسکول روانہ ہونے سے پہلے ان ہی کی بوہنی کیا کرتا۔ جس دن انہیں آنے میں دیر ہوجاتی۔ وہ سمجھ جاتا کہ آج سکول میں چھٹی ہے۔ وہ ان کے لئے ہمیشہ بڑھیا سے بڑھیا سنگترے کی پھانکیں اور دوسری انگریزی مٹھائیاں لایا کرتا اور نفع کا خیال کئے بغیر ہمیشہ گنتی سے زیادہ دیا کرتا۔

کبھی کبھی وہ چھوٹے بھائی سے کہتا۔ ''افضل میاں سکول سے دیر ہوگئی ہے نا' دیکھنا آج کیسے کان اینٹھیں گے ماسٹر صاحب'' اور افضل میاں اس کے سانولے رنگ کو گھور کر کہتے۔ ''چپ رہو تم کالا آدمی' ہم تم سے بات کرنا نہیں مانگتا۔'' اور وہ دونوں ہنستے ہوئے وہاں سے چل دیتے۔

ایک دن صبح کو بڑا بھائی آیا لیکن چھوٹا نہ آیا۔ جب اس نے پھانکیں خریدنے کے لئے جیب سے پیسے نکالے تو سبحان نے پوچھا۔ ''افضل میاں کہاں ہیں؟''

''وہ ماموں کے ساتھ گاؤں گیا ہے۔'' لڑکے نے جواب دیا اور وہ اکیلا ہی سکول روانہ ہوگیا۔

جب چار پانچ روز تک سبحان نے افضل کی صورت نہ دیکھی تو اسے بے چینی سی ہونے لگی۔ آخر چھٹے روز جب دونوں بھائی پہلے کی طرح اسکول جاتے ہوئے اس کی دکان پر آئے تو اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی کھوئی ہوئی چیز مل گئی۔

ان لڑکوں کے جانے کے بعد کوئی گھنٹہ بھر بعد ایک خالی تانگہ مکان کے نیچے آ کر رکتا اور کوچوان گھنٹی بجاتا۔ سبحان سمجھ جاتا کہ اب صاحبزادیوں کے سکول جانے کی باری ہے۔ جب انہیں آنے میں کچھ دیر ہو جاتی تو کوچوان بے صبری سے پے در پے گھنٹی بجانا شروع کر دیتا۔ اس پر پہلی منزل کے بخارچے میں سے بوڑھی ماما چق کو سرکا کر اپنا سر باہر نکالتی اور تانگے والے سے کہتی ''دم لو میاں آتے ہیں ابھی آتے ہیں۔''

یہ سن کر تانگے والا بڑبڑاتا ہوا تانگے سے اتر کر سبحان کے ٹھیلے کے پاس جاتا اور اس سے قینچی کے دو سگریٹ خریدتا اور سوفٹ ملٹھی والا پان بنوا کر کھاتا۔ آخر وکیل صاحب کی تینوں بڑی صاحبزادیاں ماما کے ہمراہ سیڑھیوں سے اترتیں۔ بڑی کی عمر اٹھارہ' منجھلی کی سولہ اور چھوٹی کی تیرہ برس۔ تینوں کے مصری وضع کے برقعے' ایک کتھئی رنگ کا' ایک سیاہ رنگ کا اور ایک سلیٹی رنگ کا' تینوں کے پاؤں میں سینڈل۔ دو بڑی بہنیں تانگے کی پچھلی سیٹ پر بیٹھتیں اور چھوٹی بہن اور ماما اگلی سیٹ پر اور تانگے والا ایک بڑی سی سفید چادر تانگے کے آگے پیچھے تان دیتا۔ ماما سیر بھر برف کا چورا کر کے تھرمس بوتل میں بھروا دیتی۔ وہ اپنے لیے سبحان سے ایک برابر کا پان بھی بنواتی جس میں وہ بہت سا کالا تمباکو ڈلوایا کرتی۔ کبھی کبھی منجھلی صاحبزادی کو بدہضمی کی شکایت ہوتی تو وہ سوڈے کا ایک ادھا ماما سے منگوا کر پیا کرتی اور تانگہ چل دیتا۔

اس کے تھوڑی ہی دیر بعد مختار اور شمشاد وکیل صاحب کے بڑے صاحبزادے موسم گرما کے ہلکے پھلکے کپڑے پہنے' اپنی اپنی سائیکل کندھے پر اٹھائے سیڑھیوں سے اترتے دکھائی دیتے۔ وہ سڑک کو پار کر کے سبحان کے ٹھیلے کے پاس آ کھڑے ہوتے۔

سبحان انھیں سلام کرتا جس کا وہ خندہ پیشانی سے جواب دیتے۔ مگر وہ دونوں ہر وقت ایسی گرما گرم بحث میں الجھے رہتے کہ سبحان باوجود کوشش کے ان سے کوئی بات نہ کر پاتا۔ پھر ان کی باتیں بھی عموماً ایسی ہوتیں کہ سبحان کے کچھ بھی پلے نہ پڑتا۔ ان کے جوش وخروش تیز لہجے اور آنکھوں کی چمک کو دیکھ کر معلوم ہوتا کہ وہ کسی بہت ہی دقیق مسئلے پر بحث کر رہے ہیں۔ گفتگو کا جتنا حصہ سبحان کی سمجھ میں آتا وہ کچھ اس قسم کا ہوتا۔

''شمی تمہاری عقل کو کیا ہو گیا ہے بھلا افلاطون......''

''لیکن بھائی جان آپ بھی تو ذرا غور فرمایئے کہ ارسطو......''

''شمی میں کہتا ہوں کہ تم کیسی بچوں کی سی باتیں کر رہے ہو۔ مانا کہ......''

''وہ تو صحیح ہے لیکن بھائی جان ان دلائل کی روشنی میں......''

''یہ سراسر ہٹ ہے تمہاری شمی''

''بھائی جان لیکن پروفیسر صاحب......''

''شمی......''

''بھائی جان......''

''شمی......''

''بھائی جان......''

غرض کالج کو جاتے۔ کالج سے آتے۔ ہاکی کھیلنے جاتے۔ ہاکی کھیل کر آتے' جب کبھی دونوں بھائی ساتھ ساتھ ہوتے یہ بحث یوں ہی جاری رہتی۔ کبھی کبھی وہ انگریزی میں بھی گفتگو کرنے لگتے۔ پھر تو ان کا جوش وخروش اور بھی بڑھ جاتا ایسے موقعوں پر سبحان نیچی نظریں کر کے مسکرایا کرتا۔

مختار بائیس سالہ نوجوان تھا۔ صحت وتوانائی کا مجسمہ' بھرا بھرا جسم' سرخ وسفید چہرہ' شربتی رنگ کی آنکھیں۔ بھورے گھنگریالے بال۔ شمشاد اس سے دو سال چھوٹا تھا۔ مگر اس کے باوجود اس کا قد بڑے بھائی سے نکلتا ہوا تھا۔ ظاہری جمال میں وہ مختار کے برابر نہ تھا۔ البتہ اپنی آنکھوں کی غیر معمولی چمک سے وہ اس سے کہیں زیادہ ذہین معلوم ہوتا تھا اور سبحان نے بارہا محسوس کیا کہ مختار بحث میں اپنے بڑے ہونے کا ناجائز فائدہ اٹھا کر خواہ مخواہ چھوٹے بھائی کو ڈانٹتا ڈپٹتا ہے اور یہ شمشاد کی سعادت مندی ہے کہ وہ ہمیشہ بڑے

بھائی کا احترام ملحوظ رکھتا ہے۔

سبحان ان کے لئے حسب معمول دوکرارے دیسی پان چن کر نکالتا اور ان پر چونا کم اور کتھا زیادہ رچنے کے لیے رکھ دیتا۔ وہ اپنی بحث کے دوران جھاڑن مانگتے اور سائیکلوں کو بھی جھاڑتے پونچھتے جاتے اور ساتھ ساتھ بحث بھی کرتے رہتے۔ کبھی کسی پہیے میں ہوا کم ہوتی۔ تو وہیں سے ملازم لڑکے شبیر کو آواز دے کر پمپ منگوایا جاتا اور پہیے میں ہوا بھری جاتی مگر اب بھی کیا مجال کہ بحث لمحہ بھر کے لیے بھی رکنے پائے۔ سبحان پانوں کے علاوہ سگریٹ کی دو ڈبیوں میں قینچی کے پانچ پانچ سگریٹ پہلے ہی سے ڈال رکھتا اور وہ اپنا پان منہ میں رکھ کر سگریٹ سلگا' سائیکلوں پر سوار ہو تیز تیز مارتے ہوئے کالج روانہ ہوتے مگر بحث بدستور جاری رہتی۔

کوئی دس بجے کے قریب ایک اور خالی تانگہ مکان کے نیچے آ کر رکتا اور سبحان کو معلوم ہو جاتا کہ وکیل صاحب کے کچہری جانے کا وقت ہو گیا۔ اس وقت اس کا ٹھیلہ وکیل صاحب کے مکان کی سیڑھیوں کے برابر کھڑا ہوتا وہ پہلے ہی ایک اچھا سا پان چھانٹ کر لگا رکھتا۔ آخر سیڑھیوں میں بھاری قدموں کی آہٹ سنائی دیتی اور وکیل صاحب سیاہ شیروانی پہنے' سر پر مشہدی پگڑ نڈی باندھ' چھڑی ٹیکتے ہوئے سیڑھیوں سے اترتے۔ ان کی عمر پچاس برس کے لگ بھگ تھی۔ بھاری بھرکم آدمی تھے مگر چاق و چوبند' فرانسیسی تراش کی ڈاڑھی جس میں اب کچھ دنوں سے سفید بال زیادہ نظر آنے لگے تھے۔ چہرے سے قناعت اور بردباری ٹپکتی تھی۔ کثرت اولاد کی وجہ سے ہر ایک کو شفقت کی نظروں سے دیکھنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ سبحان کے سلام کے جواب میں وہ اس سے ایک آدھ بات کر لینا خواہ وہ بے معنی ہی کیوں نہ ہو' اپنا اخلاقی فرض سمجھتے تھے۔

''بھئی سبحان آج کل خربوزے بڑے پھیکے آ رہے ہیں۔''

''آم بھی تو کھٹے ہیں سرکار''

''سچ کہتے ہو۔'' یہ کہہ کر تانگے میں بیٹھ جاتے اور سبحان معمول کے مطابق پان' قینچی کی ڈبیا' دیا سلائی کا بکس اور ایک کاغذ کے ٹکڑے پر تھوڑا سا چونا رکھ کر' کہ وہ زیادہ چونا کھانے کے عادی تھے' تانگے کے پاس جا یہ چیزیں انہیں دے دیتا۔ کبھی کبھی ان کا مختار بھی فائلیں لیے ان کے ہمراہ ہوتا اور سبحان کو اس کے لئے پان میں بہت سے سونف ڈالنی پڑتی۔

وہ وکیل صاحب اور ان کی بیگم بہت سے ملنے والوں کو بھی جاننے لگا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ بدھ کے روز تیسرے پہر حاجی صاحب کے ہاں سے زنانہ سواریاں آیا کرتی ہیں۔ چنانچہ جیسے ہی ان کا تانگہ آ کے رکتا وہ لائم جوس' رس بھری وغیرہ کی بوتلیں پہلے ہی سے دھو دھا کر نکال رکھتا۔ ان سواریوں کے ساتھ جو بچے آتے ان کی دل پسند مٹھائیوں کا بھی اسے پتہ تھا۔

اتوار کے روز عموماً ڈاکٹر علیم الدین یا خیر اللہ چائنا والے کے خاندان آیا کرتے‘ موخر الذکر وکیل صاحب کے دور کے قرابت داروں میں سے تھے اور ان ہی کی طرح کثیر اولاد۔ قریب کے رشتہ داروں میں جو کبھی کبھی ملنے آ جاتے اور جن کو سبحان اچھی طرح جانتا تھا‘ ایک تو بیگم صاحبہ کا چھوٹا بھائی تھا جس کی بزازی کی دکان تھی۔ جب کبھی وہ آتا کپڑے کا ایک آدھ تھان اس کی بغل میں ہوتا۔ یہ تھان کبھی تو وکیل صاحب کے ہاں ہی رہ جاتا اور کبھی وہ واپس اپنے ساتھ لے جاتا اور دوسرے وکیل صاحب کے تایا جو بے حد ضعیف تھے اور اپنے بیٹے کے ساتھ شہر کے دوسرے سرے پر رہا کرتے تھے۔ جب کبھی یہ باپ بیٹے ملنے آتے تو دن بھر ان کے گھر ہی پر رہتے اور رات کو بڑی دیر میں کھانا کھا کر جاتے۔

وہ مختار اور شمشاد کے بعض دوستوں کو بھی جانتا تھا جو ان سے ملنے آیا کرتے تھے‘ خصوصاً ریاض کو۔ شام کو جب وہ ہاکی کھیل کر واپس آتے تو اکثر ریاض بھی سائیکل پر ان کے ہمراہ ہوتا۔ وہ شمشاد کا ہم عمر اور کالج میں اس کا ہم سبق تھا۔ مختار سے اس کی زیادہ بے تکلفی نہ تھی۔ وہ چونکہ شمشاد کا بڑا بھائی تھا اس لئے ریاض بھی اس کا ادب کیا کرتا تھا۔ ریاض ان دونوں بھائیوں سے قد میں چھوٹا تھا اور رنگت بھی ان جیسی سرخ وسفید نہ تھی۔ تاہم اس کی ملاحت میں ایک خاص بانکپن تھا‘ متبسم چہرہ‘ زندگی کی مسرتوں سے بھرپور اور فکروں سے آزاد۔ شمشاد کو اس سے اور اس کو شمشاد سے گہری وابستگی تھی۔

سبحان کے ٹھیلے کے قریب جو اس وقت وکیل صاحب کے مکان کے عین مقابل سڑک کے کنارے ہوتا۔ یہ تینوں نوجوان اپنی اپنی بائیسکل تھامے رخصت سے پہلے کچھ باتیں ضرور کرتے۔ جب کبھی ریاض ان بھائیوں کی بحث میں شامل ہو جاتا۔ پھر تو بحث طول ہی کھینچتی چلی جاتی۔ سبحان سے بار بار پان اور سگریٹ لیے جاتے۔ ریاض بار بار خدا حافظ کہتا۔ مگر رخصت نہ ہونے پاتا۔ غرض گھنٹہ گھنٹہ ڈیڑھ ڈیڑھ گھنٹہ یوں ہی باتوں میں گزر جاتا۔ اس دوران وکیل صاحب کے مکان کی دوسری منزل میں جہاں بڑی صاحبزادی کا کمرہ تھا‘ بار بار ایک رنگین سایہ چقوں کے پیچھے حرکت کرتا رہتا جسے سبحان کی کن انکھیوں کے سوا اور کوئی آنکھ نہ دیکھ سکتی۔

وکیل صاحب کے صاحبزادوں اور صاحبزادیوں سے رشتے کے سلسلے میں جو لوگ آیا کرتے سبحان ان کو بھی خوب پہچانتا تھا۔ ایسے موقعوں پر اس کی بکری ایک دم بڑھ جاتی اور گھر کے ملازموں اور بوڑھی ماما کے ساتھ ساتھ وکیل صاحب کے چھوٹے لڑکے اور لڑکیاں بھی دوڑ دوڑ کر سبحان کی دکان پر سودا لینے آتے تھے۔ ان لوگوں کے جانے کے تھوڑی دیر بعد سبحان ٹوہ لگاتا کہ کہیں بات پکی ہوئی یا نہیں وہ شبیر سے ہنس کر کہتا۔ ”پانچوں گھی میں ہوں گی اور سر کڑھائی میں۔“

شبیر حیران ہو کر پوچھتا۔ ''کیا کہا تم نے؟''

''زیادہ بنو نہیں ہم سے' سب خبر ہے ہمیں۔''

شبیر اب بھی لاعلمی ظاہر کرتا تو وہ سمجھ جاتا کہ اس کو واقعی خبر نہیں اور پھر وہ ماما کی طرف رجوع کرتا جس سے اکثر باتیں معلوم ہو جایا کرتی تھیں۔ بڑی بی وکیل صاحب کی سب سے پرانی ملازمہ تھیں۔ ان کے سارے بچے ان ہی کی گود میں پلے بڑھے تھے۔ ان کی اپنی کوئی اولاد نہ تھی۔ نہ کوئی رشتہ دار تھا ان بچوں سے انہیں دلی محبت تھی اور اس کی بنا پر وہ ان کے مستقبل کے بارے میں رائے زنی کرنا اپنا حق سمجھتی تھیں۔ چنانچہ محبت اور سادگی میں انکی زبان سے بے ساختہ نکل جاتا۔

''تو ج جوان لوگوں میں رشتہ ہو مجھے تو یہ ایک آنکھ نہیں بھاتے۔'' پھر ذرا تامل کر کے کہتیں۔ ''گھبراؤ نہیں' وہ دن بھی آ جائے گا۔ چاند سی بیٹیاں ہیں میری۔''

اور سبحان سمجھ جاتا کہ ان لوگوں سے بات نہیں ٹھہری۔ یوں ہی کسی موقع پر افضل میاں سے کہتا۔ ''شہ بالا بنے گا میرا میاں۔ ہم کو بھی گھوڑی پر چڑھاؤ گے نا؟''

اگر اس قسم کی کوئی بات گھر میں ہوئی تو افضل میاں شرما کر چل دیتے یا معلوم نہ ہوتا تو کہتے۔

''چپ رہو تم کالا آدمی' ہم تم سے بات کرنا نہیں مانگتا۔''

ایک دن ایسے ہی موقع پر جب کچھ عورتیں آئی ہوئی تھیں' بڑی بی پان لینے آئیں ان کا سانس پھولا ہوا تھا۔ مگر وہ بہت خوش معلوم ہوتی تھیں۔ سبحان نے ان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا ہی تھا کہ وہ پھٹ پڑیں۔

''کسی سے ذکر نہ کیجو' خبردار۔ بڑی صاحبزادی کی بات ٹھہر گئی۔''

''کب؟''

''ابھی ابھی''

''کون لوگ ہیں؟''

''شہر کے مشہور ڈاکٹر ہیں۔ لڑکا بی اے میں پڑھتا ہے۔ پر خبردار کسی سے ذکر نہ کر بیٹھو۔ سو دشمن ہیں' سو دوست۔ میں نے گھر کا آدمی سمجھ کے تم سے کہہ دیا ہے تم کسی سے نہ کہنا۔ بچوں سے بھی نہیں' نوکروں سے بھی نہیں۔''

اس کے دو تین ہی دن بعد سبحان نے کئی اور ذریعوں سے بڑی بی کی بات کی تصدیق کر لی۔ سمدھیوں میں میل جول بڑھنے لگا۔

عورتیں تو آتی جاتی ہی رہتی تھیں۔ ایک بار لڑکے کے والد ڈاکٹر صاحب بھی اپنی موٹر میں بیٹھ کے وکیل صاحب سے ملنے آئے اور دیر تک ان سے باتیں کرتے رہے۔ دوسری مرتبہ ضیافت پر آئے۔ اس موقع پر ان کا بیٹا بھی ہمراہ تھا وہ خاصا قبول صورت تھا مگر کسی قدر لاغر معلوم ہوتا تھا۔ بڑی بی نے کہا ''امتحان کی فکر ہے بچارے کو۔'' سبحان کو اس کا نام بھی معلوم ہو گیا' صغیر احمد۔ قرار یہ پایا کہ جب لڑکا امتحان دے لے تو اس کی شادی کر دی جائے گی۔

بڑی صاحبزادی کے جہیز کے لیے جلدی جلدی جو زیورات و ملبوسات تیار کرائے جا رہے تھے سبحان ان کی پوری تفصیل جانتا تھا۔ اس دوران میں شمشاد میاں کے دوست ریاض بھی کئی مرتبہ ہاکی کے بعد ان دونوں بھائیوں کو ان کے گھر تک پہنچانے آئے اور سبحان نے دیکھا کہ دوسری منزل میں چقوں کے پیچھے وہ رنگین سایہ اب بھی حرکت کرتا ہے۔

اور ایک دن اچانک سبحان کے ذہن میں ایک بات آئی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ صاحبزادی کو یہ رشتہ منظور نہ ہو۔ یہ بات اسے کسی نے نہیں سجھائی تھی اور سجھاتا بھی تو کون۔ کیونکہ وکیل صاحب یا گھر کے کسی اور آدمی کو اس کا گمان تک نہ تھا۔ اس نے مختلف ذریعوں سے معلومات حاصل کر کے خود ہی یہ نتیجہ نکالا تھا۔ آخر اس نے بھی ایک عمر گزاری تھی۔ زمانے کا سرد گرم دیکھا تھا۔ دو تین مرتبہ بڑی بی اور بچوں سے اسے معلوم ہوا تھا کہ صاحبزادی کی طبیعت ناساز ہے ایک دن دیکھا کہ تانگے میں سوار ہوتے وقت وہ بڑی بے دلی سے قدم اٹھا رہی ہے۔ ایک دن وہ اپنی بہنوں کے ساتھ اسکول نہیں گئی بلکہ درد سر کی وجہ سے گھر ہی میں رہی مگر اسی شام کو جب مختار اور شمشاد کے ساتھ ریاض میاں سبحان کی دکان پر آئے اور سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگے تو اس نے دوسری منزل میں چقوں کے پیچھے اس رنگین سائے کو پہلے سے بھی زیادہ بے چین دیکھا۔

ایسے معاملوں میں دل پر جو گزرتی ہے' سبحان اس سے بخوبی واقف تھا۔ مدت ہوئی جوانی میں وہ ایک پہاڑی مقام پر رکشا چلایا کرتا تھا تو اسے ایک عورت سے محبت ہو گئی تھی۔ دن بھر جو کچھ کماتا لا کر اس کے حوالے کر دیتا مگر اس عورت کے کچھ اور آشنا بھی تھے جن سے وہ چھپ چھپ کے ملا کرتی۔ ایک دن سبحان نے موقع پر جا لیا۔ چٹیا پکڑ کر کھینچتا ہوا اپنی کوٹھڑی میں لے آیا اور شراب کے نشے میں کچھ زیادہ ہی مرمت کر ڈالی۔ صبح کو آنکھ کھلی تو کوٹھڑی خالی تھی اور باہر آنگن میں اس کا رکشا جلا پڑا تھا۔ سبحان مدتوں اس عورت کو ڈھونڈتا رہا۔ مگر اس کی صورت پھر کبھی نظر نہ آئی اور نہ اس کی یاد دل سے مٹی۔

شادی کی تیاریاں اب اور بھی زور شور سے ہونے لگی تھیں۔ وکیل صاحب کے گھر میں ہر وقت ایک شور و غل مچا رہتا۔ طرح طرح کی اجناس تھیلوں میں لد لد کے آ رہی تھیں۔ قسم قسم کا فرنیچر' سنگھار میز' پلنگ' کرسیاں' تپائیاں' تانبے اور پیتل کے برتن جنھیں قلعی گر

نے چاندی کا سا بنا دیا تھا۔ مہمانوں کی وہ ریل پیل تھی کہ سبحان کو دکانداری سے لمحہ بھر کی فرصت نہ ملتی تھی۔ مگر پھر بھی وہ خوش نہ تھا۔ جوں جوں شادی کا دن قریب آتا جاتا اس کی افسردگی بڑھتی جاتی تھی اور اسے ایک نامعلوم ہول سا ہونے لگا تھا۔ وکیل صاحب اس سے اور بھی زیادہ لطف و مہربانی سے پیش آنے لگے تھے۔ ایک دن وہ اس سے کہنے لگے۔

''سبحان ہم تمہارے لیے بھی ایک جوڑا سلوائیں گے۔ بارات کے روز پہننا۔ دیکھنا انکار نہ کرنا۔ ہمسائے کا رشتہ عزیزوں سے کم نہیں ہوتا۔''

سبحان نے وکیل صاحب کے بچوں کو دعائیں دیں مگر یہ مژدہ بھی اس کی افسردگی کو دور نہ کر سکا۔

ایک علی الصبح سبحان نے ابھی ٹھیلہ سڑک کے کنارے لا کے کھڑا ہی کیا تھا کہ دیکھا شمشاد کندھے پر بائیسکل اٹھائے جلد جلد سیڑھیوں سے اتر رہا ہے اس نے صرف بنیان اور نیکر پہن رکھا تھا اور ابھی داڑھی بھی نہیں مونڈی تھی۔

''کہیے' شمشاد میاں صبح صبح کدھر کی تیاری ہے؟'' سبحان نے پوچھا۔

''کہیں نہیں' ڈاکٹر کو بلانے جا رہا ہوں۔'' شمشاد نے جواب دیا۔

''خیر تو ہے؟'' سبحان نے فکرمندی سے پوچھا۔

''ہاں خیر ہی ہے۔'' یہ کہہ کر شمشاد بائیسکل پر تیز تیز پاؤں مارتا ہوا چل دیا۔

سبحان کا ماتھا ٹھنکا اور وہ بے تابی کے ساتھ گھر کے اور لوگوں کی راہ دیکھنے لگا تا کہ معلوم کرے کون بیمار ہے۔ جب وکیل صاحب کے دونوں چھوٹے صاحبزادے سکول جانے کے لیے گھر سے نکلے تو ان سے معلوم ہوا کہ رات بڑی باجی کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی۔

تھوڑی دیر بعد ایک موٹر وکیل صاحب کے مکان کے نیچے رکی اور ڈاکٹر ہاتھ میں بیگ لیے اوپر گیا۔ کوئی دس منٹ کے بعد وہ نیچے اترا' سبحان اپنا ٹھیلہ چھوڑ کر اس کے پاس آ گیا مگر اس سے کچھ پوچھنے کی اسے جرات نہ ہو سکی اور وہ اور بھی زیادہ بے تابی کے ساتھ بڑی بی یا شبیر کا انتظار کرنے لگا۔

دو گھنٹے بعد ڈاکٹر پھر آیا اور جب وہ جانے لگا تو سبحان پھر اس کے قریب آ کھڑا ہوا۔ اس کے لب ہلے مگر سوال کرنے کی اب کے بھی اسے جرات نہ ہوئی۔ اس دفعہ بڑی بی پان لینے آئیں تو ان سے معلوم ہوا کہ حالت میں کچھ فرق نہیں ہے۔ ڈاکٹر شام کو پھر آنے کو کہہ گیا ہے۔

اس روز وکیل صاحب کچہری نہیں گئے۔ تیسرے پہر لڑکی کا ہونے والا سسر جو خود بھی ڈاکٹر تھا' اسے دیکھنے آیا اور ایک گھنٹہ تک اس کے پاس رہا اور جو لوگ اس کی خبر کو آئے انہیں جلد ہی رخصت کر دیا گیا۔ دن بھر مکان پر ایک مقبرے کی سی خاموشی رہی۔ شمشاد اور مختار کالج سے جلد واپس آ گئے تھے۔ شام کو وہ ہاکی کھیلنے نہیں گئے۔ ریاض شمشاد سے ملنے آیا۔ سبحان کے ٹھیلے کے قریب جب شمشاد اس سے اپنی بہن کا حال بیان کر رہا تھا تو سبحان نے سنا کہ اس کے مرض میں ابھی افاقہ نہیں ہوا۔ دونوں ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اگر آج کی رات خیریت سے گزر گئی تو پھر کوئی اندیشہ نہیں۔

جس وقت وہ باتیں کر رہے تھے تو سبحان کی نظر بے اختیار دوسری منزل پر چقوں کی طرف اٹھ گئی۔ کمرے میں روشنی ہو رہی تھی مگر وہ سایہ نظر نہیں آیا۔

تھوڑی دیر میں ریاض رخصت ہو گیا۔

شمشاد نے گھر جاتے ہوئے سبحان سے کہا۔ ''برف اور لا رکھنا۔ شاید رات کو ضرورت پڑ جائے۔''

''فکر نہ کیجئے' میں نے من بھر برف پہلے ہی سے منگوا رکھی ہے۔''

سبحان رات کو عموماً نو بجے دکان بڑھایا کرتا تھا مگر اس رات اس نے گیارہ بجے تک جمائے رکھی۔ اس دوران ملازموں سے برابر بچی کی خیریت معلوم کرتا رہا۔ اس کی حالت اگر سدھری نہیں تھی تو زیادہ بری بھی نہیں ہونے پائی تھی۔

آدھی رات کے قریب وہ ٹھیلے کو بند کر کے حسب معمول اس کے قریب ہی سڑک کے کنارے چارپائی ڈال لیٹ رہا۔ مگر آنکھوں میں نیند غائب تھی۔ کان وکیل صاحب کے مکان کی طرف لگے ہوئے تھے۔ صبح کو تین بجے کے قریب جب وہ ذرا اونگھنے لگا تو اچانک ایک طرف سے کتے کے بھونکنے کی آواز آئی اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور وکیل صاحب کے مکان کی سیڑھیوں کی طرف بھاگا مگر گھر میں بدستور خاموشی تھی۔

اس نے پتھر مار کر کتے کو بھگا دیا۔

